یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
اور
چھوٹی ڈیوڑھی والیاں
پرویز احمد

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

ڈرامہ ''یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے'' ایسے انسانوں کے درد کی داستان ہے جو آج بھی ملک کے بٹوارے کے تھپیڑوں میں جھول رہے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد میں وہ پورے جوش سے شامل تھے لیکن فرقہ وارانہ سیاست کے جنگل سے وہ ایکدم انجان تھے۔ آزادی کی ہوا کے بہاؤ کو تو انہوں نے محسوس کیا تھا، لیکن بٹوارے کا بہاؤ اُنہیں کس انجان چوراہے پر لاکر کھڑا کردے گا اس کا علم اُنہیں نہیں تھا، جانے انجانے میں وہ کب بنٹ گئے اس کا احساس بھی اُنہیں بہت بعد میں ہوا۔

اپنے بزرگوں کی روحوں کے درمیان وہ آج بھی اپنی مٹی سے چپکے ہوئے ہیں اور اُس کے سوندھے پن میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سرحد پار جابسے اپنے رشتہ داروں کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اور یہی تڑپ گھر بیٹھے بیٹھے ہی اُن کی پیشانی پر کبھی 'مسلم لیگی'، کبھی 'پاکستانی' اور کبھی 'دہشت گرد' کی تختی چسپاں کردیتی ہے لیکن جنگوں، توپوں اور بم دھماکوں سے بے پرواہ وہ اپنے رشتوں کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑنے کی کشمکش میں لگے رہتے ہیں، جب جذبات پکارتے ہیں تو اُن کے قدم سرحد پار رہ رہے اپنے رشتہ داروں کی طرف کھنچنے لگتے ہیں لیکن دل میں خواہش یہی ہوتی ہے کہ 'وہاں موت ہونے پر بھی انہیں دفنایا اپنے ملک کی مٹی میں ہی جائے' اور یہی پیچیدہ حالات اُن کے دماغ میں سوال پیدا کرتے ہیں۔ بٹوارہ ہوا تو بنٹا کون؟... خواب بنٹے، خیال بنٹے، زندگیاں بنٹیں، جذبات بنٹیں۔

ڈرامے

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

اور

چھوٹی ڈیوڑھی والیاں

پرویز احمد

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

اور

چھوٹی ڈیوڑھی والیاں

शिल्पायन
दिल्ली-110032

یہ کتاب اُردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
اس کے مشمولات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سرورق: پرمود گن پتئے

ڈرامے

ISBN 978-81-89918-79-8

پبلشر: شِلپائن
10295، لین نمبر ا، ویسٹ گورکھ پارک،
شاہدرہ، دہلی 110032
ٹیلی فون: 011-22821174
قیمت: -/75 روپے
جلد: 2011
سرورق: پرمود گن پتئے
کمپوزنگ: محمد عمر کیرانوی
مطبوعہ: رُچیکا پرنٹرس، دہلی 110032

YE DHUWAN SA KAHAN SE
UTHTA HAI AUR
CHOTI DYODHI WALIYAN (Plays)
by Parvez Ahmad

انتساب

امی کے لئے جنہوں نے ''کچھ نہیں'' میں سے ''سب کچھ'' دیا۔

اور

نانی، یعنی بی کے نام جو دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود اکثر ساتھ ہوتی ہیں۔

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

سین نمبر ایک

(دیوار پر گھڑی، کیلنڈر، ٹیبل کرسی، صوفہ اور لکڑی کی چوکی۔ ٹیبل پر پین ہولڈر، چند کاغذ اور پیپر ویٹ، ایش ٹرے۔ امین کا ڈرائنگ روم سہ پہر ہے۔ 32-31 سالہ امین کرسی پر بیٹھے ہیں۔ وہ کوئی خط پڑھ رہے ہیں۔ اُن کے چہرے پر تناؤ ہے، وہ خط ٹیبل پر رکھ کر بیڑی جلاتے ہیں... جلدی جلدی دو چار کش لیتے ہیں۔ پھر بیڑی کو ایش ٹرے میں بری طرح رگڑ کر بجھاتے ہیں۔ خط اُٹھ کر دوبارہ پڑھتے ہیں۔ پڑھ کر اُسے ٹیبل پر پٹختے ہیں۔ پڑوس میں چلنے والی لیتھ مشین کی آواز اُن کے کانوں میں لگاتار چبھ رہی ہے... اور اُن کے تناؤ میں اضافہ کر رہی ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھتے ہیں اور کھڑکی کھول کر باہر کا جائزہ لیتے ہیں)

امین :...اوہ یہ چلچلاتی دھوپ...

(امین کھڑکی بند کر لیتے ہیں۔ ایک بار خط پر نظر ڈالتے ہیں، پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، پائجامے کے اوپر پینٹ پہنتے ہیں، ٹائی لگاتے ہیں...کوٹ پہنتے ہیں...ٹوپی لگاتے ہیں اور اپنی فرینچ کٹ داڑھی پر کنگھا پھیرتے ہیں، بغل میں رول دباتے ہیں، بے چین ہو کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہیں۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو غور سے دیکھتے ہوئے) عجیب اُلجھن ہے، (امین خود سے) اِدھر کھائی اُدھر کنواں۔

امین: (پکارتے ہوئے) ''ارے بھئی، جانم ہپّو کی امّی... میں ذرا باہر تک جا رہا ہوں... دروازہ بند کر لینا۔'' (اتنا کہہ کر امین باہر نکلتے ہیں)

□ □ □

سین نمبر دو

(دوپہر کا وقت، سڑک کنارے پان کی گمٹی لوگ اِدھر اُدھر جا رہے ہیں امین آگے بڑھ رہے ہیں، تبھی ایک آدمی اُنہیں دیکھ کر)

آدمی: بابو جی... رام۔رام...۔

امین: (پورے جوش سے) رام رام... رام رام...'' (ہاتھ ملاتے ہیں... پھر کچھ سوچتے ہوئے) تم بال کشن ہونا...؟

آدمی: نہیں بابو جی!

امین: (اُس کی بات کاٹ کر) اچھا... تو موہن ہونا...؟

آدمی: نہیں بابو جی...۔

امین: (فوراً) اچھا... کیلاش؟

آدمی: سو.....

امین: ہاں... ہاں سوہن ہو... ماتا جی کیسی ہیں... پتا جی کیسے ہیں؟

آدمی (سوہن): ایک دم ٹھیک۔

امین: گھر میں سب اچھے ہیں...؟

سوہن: جی بابو جی... آپ کی دُعا ہے... اوپر والے کی مہربانی ہے.... بابو جی بہو کو لینے مہد پور جانا ہے...

امین: روڈویز کے بس اسٹینڈ پر جا کر بابو رام لال سے ملنا... کہنا شیخ صاحب نے بھیجا ہے... وہ کسی

بھی بس میں بٹھا دیں گے....

(امین سوہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں اور پان کی گمٹی پر پہنچتے ہیں۔ امین کو دیکھتے ہی بنواری پان والا (عمر 18 سال) احتراماً ہاتھ جوڑتا ہے)

بنواری: بابو جی... نمسکار۔

امین: (نمسکار کا جواب دیتے ہوئے) پتاجی کا کیا حال ہے، اب؟

بنواری: فرسٹ کلاس۔

امین: اور وشنو بھیا۔

بنواری: وہ بھی ٹھیک ہیں۔

(بنواری بیڑی کا بنڈل اور ماچس امین کی طرف بڑھاتا ہے)

امین: (بنڈل-ماچس لیتے ہوئے) اللہ تمہاری عمر دراز کرے (جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر بنواری کی طرف بڑھاتے ہیں)

بنواری: نہیں... نہیں... بابو جی رہنے دو.... مجھے تو بس آپ کا آشیرواد چاہیے۔

امین: (سکہ واپس جیب میں رکھتے ہوئے) اللہ تمہیں صحت دے.. ترقی دے...

(امین وہاں سے چل دیتے ہیں۔ تب مرزا جی فریم میں داخل ہوتے ہیں۔ انہوں نے فلم اسٹار دیوانند جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ مرزا جی کی عمر کوئی 22 سال، وہ پہلے آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں...کالر ٹھیک کرتے ہیں... جیب سے کنگھا نکال کر اپنے بالوں کو سنوارتے ہیں)

مرزا جی: (بال سنوارتے ہوئے) ''بابو جی کا سکہ تم نے بھی واپس کر دیا... یعنی ان کا ''جادوئی سکہ'' اب بھی چل رہا ہے...'' (قہقہہ لگاتا ہے)

بنواری: (سنجیدگی سے) اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

مرزا جی: بنواری تم نہیں جانتے... میں تو ایک بار بابو جی کے ساتھ اندور تک جا چکا ہوں... کرکٹ میچ

دیکھنے... ہم تانگے میں بیٹھے... بس میں بیٹھے... راستے بھر چائے سموسے کا مزہ لیا.. کرکٹ میچ دیکھا اور واپس آئے... لیکن بابوجی کا سکہ جیب میں باہر-اندر آتا رہا... جاتا رہا... مجھے تو لگتا ہے جیسے... بابوجی کی جیب میں کوئی چمبک رکھا ہو... جیسے ہی سکہ باہر قدم نکالتا ہے... چمبک اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ (**ہنستا ہے**)

بنواری: (**سمجھاتے ہوئے**) نہیں مرزاجی... یہ تو لوگوں کا پیار ہے... ہم بھی اُن سے پیسے نہیں لیتے... ہم جیسے کتنے ہی لوگ اُن کی وجہ سے بسوں میں اِدھر اُدھر فری پھوکٹ میں گھومتے رہتے ہیں... یار بتاؤ ممبئی میں آپ کا کام کاج کیسا چل رہا ہے؟

مرزاجی: (**ہونٹوں میں دبی سگریٹ سلگاتے ہیں... اور ایک لمبا کش کھینچتے ہیں**) دیوانند کے ساتھ ایک رول ملا ہے... شوٹنگ بس اب شروع ہونے ہی والی ہے۔

بنواری: ارے واہ مرزاجی... مبارکباد۔

مرزاجی: (**سینہ پھلاتے ہوئے**) بنواری... اوپر والے نے چاہا تو کچھ دنوں میں اپن کو... محمود کے رول بھی ملنے لگ جائیں گے... (**قمیض کی کالر کھڑی کر کے... خود کو آئینے میں نہارتا ہے...**)

بنواری: (**تعجب سے**) وہ کیسے...؟

مرزاجی: (**شرماتے ہوئے پھر رازدارانہ انداز میں**) کیا ہوا کہ میں ایک دن چوپاٹی پر گھوم رہا تھا.. سامنے سے دیکھا مہان کامیڈین محمود آ رہے تھے... میں اُن کی طرف بڑھا... وہ میری طرف بڑھے... میں پھر اُن کی طرف بڑھا... وہ میرے اور قریب آئے... قریب آ کر وہ مجھے غور سے دیکھنے لگے... میں ڈر گیا... بولا، ''محمود بھائی مجھ سے کیا غلطی ہو گئی؟'' وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے، ''میں محمود.... کہ تم.... محمود...؟''

بنواری: ارے غضب...

مرزاجی: (**مرزاجی نے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس جیب میں رکھا**) یہ میرے کھاتے میں ڈال دینا... (**کہا اور چل پڑے**)

❑ ❑ ❑
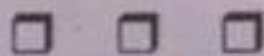
سین نمبر تین

(وہی ڈرائنگ روم، امین خیالوں میں گم اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں، تبھی تقریباً تیس سال کا ایک آدمی اندر داخل ہوتا ہے۔ یہ صابر ہیں، انہوں نے سفید رنگ کا کرتا-پائجامہ پہن رکھا ہے۔ صابر کے ایک ہاتھ میں دونہ ہے اور دوسرے میں پُڑیا)

امین: (**حیرانی سے**) ارے صابر میاں آپ... میں تو آپ کی طرف ہی آنے والا تھا...

صابر: (**ہاتھوں سے دونے اور پڑیا میز پر رکھتے اور کرسی پر دھنستے ہوئے**) اسی لئے تو میں... خود آ گیا۔

امین: (**دونے اور پڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے**) یہ کیا ہے؟

صابر: (**دونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے**) یہ بھولا گرو کے دہی بڑے اور (**پڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے**) یہ رتلامی سیو... نمکین۔

امین: ایک طرف تو تم رات-دِن کی پیٹ درد کی شکایت کرتے ہو اور دوسری طرف یہ مرچ مسالے...

صابر: ''دیکھو بھئی... ہمارے پاس تو ہر چیز کی کنجی ہے... زبان کی چٹخارے کے لیے دہی بڑے اور نمکین اور (**جیب سے دوا کی شیشیاں نکال کر**) اور یہ ہے پیٹ کے درد کا علاج... دیکھئے بھائی اپن تو ٹھہرے ٹھیٹھ مالوی... صبح ناشتے میں پوہا-جلیبی، دن میں دہی بڑے، سیو، نمکین، شام کو کچوری-سموسے اور رات کو رانا جی کا کیسریا دودھ یا ربڑی... بغیر اس کے اپنا کام تو چلتا ہی نہیں ہے... (**پکارتے ہوئے**) خانم... ذرا سنو بھائی... میرا کھانا یہیں لے آنا امین میاں کے کمرے میں...

امین: (**گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے**) یہ کھانے کا وقت ہے... شام کے چار بج رہے ہیں... (**خط صابر کی طرف بڑھاتا ہے**) انعام چچا کا خط آیا ہے۔

صابر: (خط لیتے ہوئے) اس گھڑی کی غلامی آپ کو مبارک۔ (خط پر نظر ڈال کر) 'اچھے ماموں کا خط... کتنے سال ہو گئے اُن سے ملے ہوئے... سنا ہے وہ آرہے ہیں... کتنا مزہ آئے گا... (امین کی طرف دیکھتا ہے جو اُداس پوزیشن میں بیٹھے ہیں۔) لیکن تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا؟

امین: (پریشان ہو کر) چچا آرہے ہیں... میرے پیروں تلے زمین پھٹ رہی ہے اب تمہی مجھے اس مصیبت سے بچا سکتے ہو... میں چاہتا ہوں کہ تم اُنہیں فوراً خط لکھو... اور کہو کہ وہ میرے ایڈرس پر کبھی خط نہ لکھا کریں... اور ہندوستان آئے ضرور لیکن ویزا فارم پر بھی میرا پتہ نہ لکھیں۔"

صابر: (حیرانی سے) کیا کہہ رہے ہو بھائی... اچھے ماموں تمہارے سگے چچا ہیں... وہ تمہارا پتہ نہیں دیں گے تو کسی ایرے.. غیرے... نتھو خیرے کا پتہ دیں گے.. اچھے ماموں آرہے ہیں لیکن لگ ایسا رہا ہے جیسے سانپ کے گھر نیولا آئے۔ کمال ہے بھائی۔

امین: چچا۔ وچا تو ٹھیک ہے... سچ یہ ہے کہ میں کسی پاکستانی سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتا... (صابر کی بیوی خانم ٹرے میں کھانا لے کر آتی ہے اور ٹیبل پر رکھتی ہے)

صابر: کیا...؟ لگتا ہے تم اپنا آپا کھو رہے ہو... ہوش میں آؤ بھائی، یعنی اچھے ماموں آئیں گے تو تم اُن سے ملو گے بھی نہیں؟

امین: ملوں گا کیوں نہیں؟ لیکن... میں اُنہیں اپنے گھر ٹھہرانا نہیں چاہتا...

خانم: (حیرانی اور خوشی سے) اچھے ماموں آرہے ہیں... ٹھیک ہے وہ ہمارے یہاں ٹھہر جائیں گے۔

صابر: (سنجیدگی سے) یہاں کوئی اجنبی پکنک منانے نہیں آرہا... اچھے ماموں آرہے ہیں... وہ اپنے باپ دادا کے گھر میں... اسی گھر میں ٹھہریں گے، وہ یہاں ٹھہرنا چاہیں گے، یہیں اُن کا بچپن گزرا ہے... میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے... تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟

امین: آپ اپنے پورے کان کھول کر سن لیں... میں چچا کو اس گھر میں ٹھہرا کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا... مجھے۔

صابر: کون سا خطرہ... کیسا خطرہ... ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں کسی سیتا کا اغوا ہونے والا ہے، یا تمہارا سینا تیروں سے چھلنی کیا جا رہا ہے۔

امین: تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئے گی... کیونکہ تم ٹھہرے بے لگام انسان اور میں ہوں سرکاری ملازم...۔

صابر: تو کیا ہوا... کیا اس ملک میں تم اکیلے ہی سرکاری ملازم ہو... ہزاروں مسلمان سرکاری ملازم ہیں... اور اُنہیں اپنے پاکستانی رشتے داروں سے ملنے جلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے... اور جہاں تک مجھے علم ہے... سرکار کی طرف سے بھی ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

امین: پابندی کی بات کون کر رہا ہے... میں بھی جانتا ہوں کہ پابندی نہیں ہے... لیکن یہ تم بھی جانتے ہو کہ ہمیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان کا نام آتے ہی ہماری ہر نبض ٹٹولی جاتی ہے۔

صابر: دیکھو... جنہیں شک کرنا ہے... اُنہیں آپ شک کرنے سے نہیں روک سکتے، شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ میرا تو کہنا ہے کہ آدمی کا اپنا ذہن اور ضمیر صاف ہونا چاہیے... بس اور پھر تمہارے آس پاس تو سب دوست ہوتے ہیں... کوئی دشمن تو نہیں۔

امین: سمجھتا ہوں تم جانتے ہوئے بھی میری اُلجھن کو سمجھنا نہیں چاہتے... حالانکہ تمہیں بھی پتہ ہے کہ جب سکون سے بہتا ہوا پانی اچانک طوفان بن کر کسی کو اپنی زد میں لیتا ہے... جب کوئی چنگاری آناً فاناً میں شعلے کی طرح بھڑکتی ہے اور آپ کو بھسم کرنے لگتی ہے تو اپنے بھی کئی کاٹنے لگتے ہیں۔ دوست بھی دامن بچانے لگتے ہیں۔

صابر: یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اچھے ماموں کو یہ سب پتہ چلے گا تو اُن پر کیا گزرے گی؟

امین: اُن پر کیا گزرے گی... سوال یہ نہیں ہے۔ یہاں سوال میرے اُصولوں کا ہے... اچھا ابھی تو

چلتے ہیں... مجھے کہیں جانا ہے... لیکن میری بات دھیان میں رہے۔ (امین اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا کل صبح ملیں گے۔

(امین کمرے سے باہر نکل جاتا ہے... خانم کھانے کی ٹرے لے کر اندر چلی جاتی ہیں۔ اگلے ہی پل کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ یہ بتاشی خالی یعنی امین کی چھوٹی بہن ہے)

صابر: (بتاشی کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں) بتاشی آپا، آداب۔

بتاشی: جیتے رہو... بیٹھو... کھانا کھایا؟

صابر: ابھی... ابھی کھایا۔

بتاشی: کیا کھایا؟

صابر: آلو گوشت کا سالن...۔

بتاشی: کیسا پکا تھا؟

صابر: بہت بڑھیا۔

بتاشی: کس نے پکایا تھا؟

صابر: آپ کی بہو... خانم نے۔

بتاشی: ماشاء اللہ.... ماشاء اللہ (پان دان لینے کے لئے اُٹھتی ہیں، بتاشی خود سے) ساس آرام کر رہی ہے... بہو چولہے چکی سے لگی ہے... میاں جی بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانا چٹخارے لے لیکر کھا رہے ہیں... مطلب... میاں بی بی دو جسم اور ایک جان ہو رہے ہیں۔ (وہ جلدی جلدی پان چبانے لگتی ہیں)

صابر: آپا... اچھے ماموں کا خط آیا ہے... وہ لوگ آنے والے ہیں...

بتاشی: ہاں سنا تو میں نے بھی ہے... اب دیکھو وہ گھڑی کب آتی ہے... برسوں بیت گئے... اب تو بھروسہ بھی تھک گیا ہے... انتظار بھی سو گیا... خواب بھی سوکھ گئے۔

صابر: لیکن امین تو اس خبر سے خوش نہیں ہے... وہ تو سخت پریشان ہے... جھلائے ہوئے ہیں۔

بتاشی: کیوں بھئی۔ کیاان کے گھر کوئی ڈاکہ ڈالنے آرہا ہے۔

صابر: وہ کہتے ہیں کہ کسی پاکستانی کو، چاہے وہ میری کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو، اپنے گھر پر نہیں ٹھہرائیں گے... کہتے ہیں یہ اُن کے اُصولوں کا سوال ہے۔

بتاشی: پاکستان کو مارو گولی... بھئی چچا تو چچا ہیں... دیکھو اُصول پسند ہونا کوئی بری بات نہیں ہے... امین بھائی صاحب کے کئی اُصولوں کی میں بھی قائل ہوں... اُصول اگر پھولوں کے گچھے کی طرح خوشنما ہوں... اُن کی خوشبو سے دماغ کو تازگی ملتی ہو، کوئی نئی منزل دکھائی پڑتی ہو تو کیا بات ہے... لیکن اگر اُصول کانٹوں کی طرح پاؤں میں چبھنے لگیں... اُصولوں سے فضا میں کڑواہٹ پھیل جائے.. اُصول ہاتھوں کی ہتھکڑی، پاؤں کی بیڑیاں بن جائیں... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی... مانا کہ آپ پردے کے حق میں ہیں، سنیما کے خلاف ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بچوں کو سنیما ہال سے کھینچ کر اُٹھا لائیں، اگر برقہ نہیں پہنا ہے تو بچیوں کو بھرے بازار میں شرمندہ کریں... امین بھائی صاحب کے اُصول ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں... اُصولوں کو بھی بہتے پانی کی طرح ہونا چاہیے، وقت کے ساتھ اُصولوں کو بھی مانجنا اور سنوارنا چاہیے۔

(تبھی تیئیس سال کی ایک لڑکی، بنی کمرے میں داخل ہوتی ہے جو پیدائشی گونگی ہے، بنی بتاشی کے قریب آتی ہے اور اشارے سے کچھ پوچھتی ہے۔ بتاشی ''ہاں'' کا اشارہ کرتی ہے۔ بنی کے چہرے پر خوشی کھل جاتی ہے)

صابر: **(بنی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے)** اسے کیا ہو گیا؟

بتاشی: بنی پوچھ رہی ہے کیا ایاز بھی پاکستان سے آرہا ہے؟ میں نے ''ہاں'' کہا تو بس یہ خوشی سے ناچ اُٹھی... اس منچلی کو اَب بھی یقین ہے کہ ایاز آئے گا اور اسے دلہن بنا کر لے جائے گا۔

(منچ کے ایک کونے میں بنی کھڑی دکھائی دیتی ہے، وہ ہاتھوں میں چوڑیا

ں پہن رہی ہے، لپ اسٹک لگا رہی ہے، بال سنوار رہی ہے، پھر وہ دلہن
کی طرح گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتی ہے، اُس کا چہرہ شرم سے گلابی ہے، وہ
رہ رہ کر پلک اُٹھا کر قدموں کی ٹوہ لے رہی ہے، جیسے بس ابھی اُس کا دولہا
آنے ہی والا ہے۔ اسی بیچ بتاشی اور صابر کی بات چیت جاری ہے)

صابر: اب اس گونگی سے کون شادی کرے گا؟

بتاشی: بنی گونگی ضرور ہے... لیکن وہ پاگل نہیں ہے... وہ ایاز کے عشق میں مبتلا ہے... اُسی میں کھوئی ہوئی ہے۔

صابر: لیکن کیا ایاز کو اس کی حالت کے بارے میں پتا ہے؟

بتاشی: پتا نہیں... اللہ جانے۔

صابر: کیا اُس نے بھی اب تک شادی نہیں کی۔

بتاشی: اب تک تو ایسی خبر نہیں ہے۔

صابر: مان لیجئے ایاز آیا اور اُس نے بنی کو اپنانے سے انکار کر دیا، تب کیا ہوگا؟

بتاشی: جانتی ہوں... بہت بڑا صدمہ لگے گا... بنی کو سب نے سمجھانے کی کوشش کی بھی ہے... لیکن وہ مانتی ہی نہیں اور پھر بد بخت کے لئے کوئی رشتہ بھی نہیں ملتا۔

(تبھی اچانک دروازہ کھلتا ہے اور امین داخل ہوتے ہیں۔ امین کو دیکھتے
ہی صابر اور بتاشی سنبھل جاتے ہیں۔ امین اُن دونوں کو غور سے دیکھتا ہے،
پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ بنی اپنے آپ میں مگن ہے۔ پھر وہ کھڑکی
کے قریب جا کر جھانکنے لگتی ہے)

بتاشی: (کرسی کھینچتے ہوئے) ''بھائی صاحب بیٹھئے نا...''

امین: (اپنے ہونٹوں کی پپڑی اُدھیڑتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ پاکستانی فوجوں نے ہم پر حملہ بول دیا ہے۔ سرحد پر جنگ چھڑ چکی ہے۔ (اتنا کہہ کر امین باہر چلے جاتے ہیں)

بتاشی: (اپنا ماتھا ٹھوک کر) ''لو لے لو لڈو... امین بھائی صاحب کی دلی مراد پوری ہو گئی... اب آ چکے تمہارے اچھے ماموں۔''

(ہم بنی کو دکھاتے ہیں۔ یہ خبر سن کر اُسے جھٹکا لگتا ہے۔ اُس کے چہرے پر اُداسی چھا جاتی ہے۔ وہ اپنا گھونگھٹ ہٹاتی ہے۔ لپ اسٹک صاف کرتی ہے۔ چوڑیاں اُتار کر ایک طرف رکھتی ہے اور اُداسی کی مورت بن کر بیٹھ جاتی ہے)

(اسٹیج پر گانے والوں کی ٹیم داخل ہوتی ہے۔ اور وہ یہ غزل گاتی ہے)

پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نا جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
عاشق سا تُو سادا کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں
جی کے جِیا کو عشق میں اِس کے اپنا بارا جانے ہے
مہر و وفاہ لطف و عنایت ایک سے واقف اِن میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز وکنا یہ رمز و اشارہ جانے ہے
عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ جی اٹھتا ہے دیکھ اُسے
یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارہ جانے ہے!

□ □ □
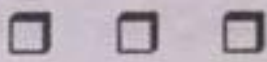
سین نمبر چار

(صابر کا ڈرائنگ روم، دیواروں پر گاندھی جی، نہرو کی تصویریں، گھڑی، ٹیبل کرسی، فرش بچھا ہے۔ چار نوجوان لڑکے۔لڑکیاں کیرم کھیل رہے ہیں۔ مرزا جی ہیں، ذیشان، نکہت اور چاندنی۔ سب کی عمر کوئی 16-17

سال۔ مرزا جی لائٹر سے بیڑی سلگانے کی کوشش کرتے ہیں، بڑی کوششوں کے بعد لائٹر جل پاتا ہے اور مرزا جی کی بیڑی سلگتے ہی سب لوگ تالیاں بجاتے ہیں)

ذیشان: مرزا جی... بیڑی جلانے کا یہ کارخانہ دینا۔

مرزا جی: اسے کارخانہ نہیں، لائٹر کہتے ہیں۔

ذیشان: لائٹر تو وہ ہوتا ہے... جو ایک بار میں جلتا ہے۔ کھٹ... کھٹ... کھٹ.. یہ تو کارخانہ ہی ہوا نا۔

چاندنی: (ذیشان کی طرف دیکھ کر) اچھا آپ بھی بن لو... ہیرو بن لو... ابھی تایا ابا آئیں گے نا... تب پتہ چلے گا۔

مرزا: اے بی بی... امین بھائی صاحب کا نام نہ لو... اُن کے ذکر سے ہی میری روح قبض ہونے لگتی ہے....

ذیشان: مرزا جی... ہم آپ کی فلم دیکھنے گئے تھے۔

چاندنی: دیکھنے تو میں بھی گئی تھی... لیکن...؟

مرزا: لیکن کیا...؟

ذیشان: اُس میں آپ دکھائی نہیں دیے۔

مرزا: اچھا میں... تمہیں دکھائی نہیں دیا... وہ سین یاد ہے تم کو، جب پرتھوی راج کپور اپنے دربار میں راجا بن کر بیٹھا تھا.. تب اُن کے پیچھے کھڑے ہو کر پنکھا کون جھل رہا تھا... کون تھا وہ... وہ میں ہی تھا.. (سب زور سے ہنستے ہیں) شوٹنگ کے وقت وہ سین کافی لمبا تھا... اب بعد میں ڈائریکٹر نے کاٹ دیا تو میں کیا کروں؟

(تبھی کمرے میں بنی داخل ہوتی ہے۔ سبھی بنی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں)

(سب ایک آواز میں): آؤ... آؤ بنی آپا۔ (بنی آکر وہیں بیٹھ جاتی ہے)

چاندنی: بنی آپا آپ کے من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے... ایاز بھائی جو آرہے ہیں۔ (بنی کا چہرہ اُداس ہو جاتا ہے)

ذیشان: ارے آپا اتنی اُداس کیوں ہو...وہ آ رہے ہیں...

بنی: (' نہ' میں گردن ہلاتی ہے اور اُٹھ کر باہر چلی جاتی ہے)

چاندنی: بے چاری بنی آپا...

مرزا جی: تم لوگ تو بچے تھے...ہم تو بنی آپا کو خوب چھیڑتے تھے...بنی بوٹی، ایاز ہڈی (زور سے ہنستا ہے)

ذیشان: اچھا...؟

مرزا: اور کیا...جب ایاز بھائی یہیں تھے، تب بنی آپا اور وہ، دونوں چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے...
بچ میں وہ دونوں ہڈی- بوٹی کی طرح ایک دوسرے سے چپکے رہتے تھے۔

چاندنی: '' اچھا...(موضوع بدل کر) ذیشان...اپنے صابر ماموں نے بھی تو فلموں میں کام کیا تھا۔

ذیشان: ہاں کیا تھا...پھر وہ فلم ایجنٹ بن گئے تھے...

مرزا: ہاں...ہاں...وہ فلم تو پورے شہر نے مفت میں ہی دیکھی تھی...صابر ماموں نے فلم کے فری پاس بانٹے...نہیں...لٹائے تھے...لٹائے۔

مرزا: اور اُن کی لال فئٹ کار...جس دن اُن کی فئٹ کار بکی میں نے خدا کا شکر ادا کیا...جہاں دیکھو سانڈ کی طرح اڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی...بھیا اپنے تو دھکے لگاتے لگاتے بازو اینٹھ گئے تھے۔

ذیشان: (ہنسی پر قابو پاتے ہوئے)...اُن کا پچھلا الیکشن...(سب ہنستے ہیں) اُنھوں نے سماج سیوا کے دو بڑے کام کیے...ایک تو طوائفوں کے ناچ گانے کے وقت پر لگی پابندی ہٹوا دی...دوسرا اپنے محلے میں بجلی کے کھمبے لا کر ڈلوا دیے...ایسا لگا تھا جیسے ابھی تار کھنچیں گے اور ہر گھر میں بلب جل اُٹھیں گے...لیکن ہوا یہ کہ...ادھر پولنگ ختم ہوئی اور اُدھر کھمبے غائب...(سب ہنستے ہیں)

نکہت: اور چناؤ ہارنے کے بعد...ہمارے ماموں...ایسے سینا تان کے گھوم رہے تھے...کہ اُن کے آگے جیتنے والے بھیگی بلی لگ رہے تھے۔

چاندنی: (قدموں کی آواز سن کر)..لگتا ہے...تایا ابو آرہے ہیں...

(یہ سنتے ہی کمرے میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ بیڑی ماچس چھپائی جاتی ہے، کیرم ہٹایا جاتا ہے، دونوں لڑکیاں سروں پر دوپٹے ڈھک لیتی ہیں۔ سب شریف بچے بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نکہت اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ امین اپنے خاص انداز میں کوٹ، پتلون، ٹائی، سر پر ٹوپی اور بغل میں رول دبائے داخل ہوتے ہیں)

نکہت: ماموں جان سلام۔

امین: (نکہت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) وعلیکم السلام...جیتی رہو...(باری باری وہ سبھی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں..اور دُعائیں دیتے ہیں)

امین: (نکہت سے) بیٹے پہلے پانی پلواؤ...اور پھر ذرا اپنی ممانی سے کہہ کر پان بنواؤ۔ (ذیشان سے) اور بیٹے امّی - ابو...سب ٹھیک ہیں نا...پڑھائی ٹھیک چل رہی ہے...؟

ذیشان: ماشاء اللہ....الحمد للہ....(تبھی دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے...مرزا جی دروازہ کھولتے ہیں۔ صابر داخل ہوتے ہیں)

صابر: (سب کی طرف دیکھ کر سلام دُعا کرتے ہیں پھر امین سے مخاطب ہو کر) خوشخبری یہ ہے کہ مجھے....جماعت علماء کا...ضلع صدر.....بنایا گیا ہے۔

امین: (ہنس کر) علما....آپ علماؤں یعنی عالموں کی جماعت میں کیسے شامل ہو سکتے ہیں بھئی... دسویں کلاس تک تو پاس کی نہیں تھی آپ نے۔

صابر: (برا مان کر، فخر کے ساتھ) ترقی کے لیے...کلاس نہیں قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے...سمجھے۔

امین: (طنز سے) جی ہاں! ہمیں بھی پتہ ہے...آپ کی یہ جو سیاست ہے نا...نوٹ اور ووٹ کے چکر میں...(صابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کسی بھی چینٹی کو...چیتا بنا سکتی ہے....

صابر: (اپنی گردن چھڑانے کی کوشش میں موضوع بدلتے ہوئے) اچھا ٹھیک ہے بابا...جنگ کے

میدان کی کیا خبر ہے؟

امین: ہوسکتا ہے کہ ہماری فوجیں ایک آدھ دن میں لاہور فتح کر لیں۔

صابر: یہ کہیں یکطرفہ خبر تو نہیں ہے.....ریڈیو پاکستان سنا کسی نے؟

امین: کیا مطلب...؟ آپ کا دماغ تو صحیح ہے...اس ماحول میں جناب ریڈیو پاکستان سننا چاہتے ہیں... پتہ ہے کلیا پان والے نے یہی حماقت کی تھی...اب حوالات کی ہوا کھا رہا ہے...

صابر: میرے خیال سے سرکار نے ایسی کوئی پابندی تو نہیں لگائی ہے...چلئے پھر بھی احتیاط تو برتنا چاہیے...ہم بی.بی.سی ریڈیو سن لیں گے۔

❑ ❑ ❑
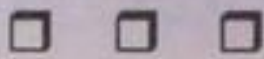
سین نمبر پانچ

(صابر کا ڈرائنگ روم۔ خانم اپنے 14 برس کے بیٹے کو پڑھا رہی ہیں، تبھی صابر آتے ہیں)

صابر: **(ہاتھ کا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے)** محلے میں کس قدر سناٹا ہے...ایسا لگ رہا ہے جیسے جنگ یہیں ہو رہی ہو...

خانم: **(سنجیدگی سے)** سائرن بجتے ہی لوگ گھروں میں دبک جاتے ہیں...بلیک آؤٹ میں کریں بھی تو کیا...؟

صابر: **(فخر سے)** اس مصیبت کی گھڑی میں لوگوں کا جوش دیکھتے بنتا ہے...خون دینے کے کیمپ میں کتنے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا...دن بھر نعرے لگتے رہے...اون دو، خون دو... پاکستان کو بھون دو....

(خانم...صابر کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں)

دانش: **(جوشیلے انداز میں)** آج ہمارے ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگلی چھٹیوں میں اسکول

ٹرپ لاہور جائے گی... میں بھی جاؤں گا پاپا... آپ مجھے جانے دیں گے نا...؟ (صابر اور خانم ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں)

دانش: (بھولے پن سے) ہماری فوجیں لاہور پہنچ رہی ہیں... آپ لوگ خوش کیوں نہیں ہیں...؟ جمعے کی نماز کے بعد... کل مولوی صاحب بھی ہماری جیت کے بجائے... سرحد پر امن کی دُعا مانگ رہے تھے... کیوں؟

صابر: بیٹے... ہم بھی چاہتے ہیں کہ جیت ہماری فوجوں کی ہی ہو.... اور تم اسکول ٹرپ میں لاہور ضرور جانا... ٹھیک ہے۔" (دانش خوش ہو جاتا ہے) لیکن اب ذرا پڑھائی پر زیادہ دھیان دیجئے... (دانش خوشی خوشی اپنا بستہ سمیٹ کر باہر چلا جاتا ہے)

خانم: (سوچتے ہوئے) جب ہماری فوجیں لاہور پہنچیں گی... تو وہاں... خون خرابا ہو جائے گا۔

صابر: (دلاسا دیتے ہوئے)... میں آپ کی فکر سمجھ رہا ہوں... لیکن خانم... میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہ جنگ ہے... اور جنگ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

خانم: (بھرائی آواز میں) آپ تو جانتے ہیں... لاہور میں ابا کا گھر... امرتسر بارڈر سے زیادہ دور نہیں ہے...

صابر: (خانم کا ہاتھ تھام کر) ہمت سے کام لو خانم... خدا سب ٹھیک کرے گا۔

□ □ □
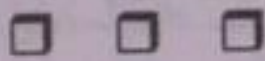
سین نمبر چھ

(امین صابر کے کمرے میں بیٹھے ہیں، صابر اُٹھ کر ریڈیو آن کرتا ہے)

یہ آکاشوانی ہے، اور آپ دیو کی نندن پانڈے سے سماچار سن رہے ہیں۔
آج جموں علاقے میں ہندوستانی جوانوں نے پاکستانی فوج کو بری طرح کھدیڑ دیا... ہمارے بہادروں نے دشمنوں کی تین چوکیوں پر قبضہ کر لیا،

اس گھماسان لڑائی میں دشمن کے سات ٹینک بھی تباہ کر دیے گئے...

(صابر ریڈیو کی سوئی گھماتا ہے)

یہ ریڈیو پاکستان ہے، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں، آپ انور بہزاد سے خبریں سن رہے ہیں۔ پاکستان کے جانباز جوانوں نے آج دشمن کے حملے کا منھ توڑ جواب دیا اور اُس کے چار ٹینک نیست و نابود کر دیے۔ **(صابر ریڈیو آف کرتا ہے)**

صابر: دونوں کے اپنے اپنے دعوے...

امین: اور ہمارے راشٹر پتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے پتا ہے کیا کہا ہے... اُنہوں نے کہا ہے، ''یہ جنگ نہیں ہے... اصل میں دو بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں۔''

صابر: مجھے تو 1947ء کا زمانہ یاد آرہا ہے۔

امین: وہ سب سوچ کر تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... ہمیں تو دادا نے اُس آگ سے بچا لیا۔

صابر: ہاں مجھے یاد ہے... دادا اکرام الحق... وہ تو گاندھی جی کے پکّے شیدائی تھے... کیا دبدبا تھا اُن کا... اُن کے رہتے مرزاواڑی میں... کیا مجال کہ کسی کی زبان سے پاکستان کا 'پ' نکلتا۔

امین: **(خیالوں میں کھوتے ہوئے)** ہم لوگوں کی عمر تب کیا ہوگی... 14-13 سال... نا سمجھ ہی تھے... وہی ناسمجھی مجھے ایک دن مسلم لیگ کے جلسے میں لے گئی... ہمارے دوست شریف کا کچا ذہن بھی جذبات میں بہہ گیا۔ ہم اُس جلسے سے واپس آگئے... تب شریف نے مسجد کی دیوار پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ''پاکستان زندہ باد''... لیکن جیسے ہی یہ بات دادا کے کانوں تک پہنچی وہ آگ بگولا ہو گئے... سارے محلّے کو اکٹھا کیا اور بولے، یہ کس نامعقول کی حرکت ہے... یہ کون ''لیگی'' ہمارے بیچ گھس آیا ہے... اس کا فوراً پتہ لگایا جائے... دہشت کی وجہ سے میری روح کانپ گئی... میں زبان کھول ہی نہیں پایا... دیر

رات جب سب سو گئے... میں اُٹھا اور دبے پاؤں باہر نکلا اور شریف کو بھی اُٹھایا اور اُس کی قمیض سے مسجد کی دیوار پر لکھی عبارت کو مٹا آیا... لیکن وہ واقعہ میرے دماغ سے آج تک نہیں مٹا... (ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے)

صابر: سچ تم نے شریف کو دادا کے جلال سے بچالیا... لیکن یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ان سب کے باوجود... مرزاواڑی سے جو پہلا شخص پاکستان گیا وہ تھے... چچا انعام الحق... یعنی عظیم دیش بھگت اکرام الحق کے سگے بھائی...؟

امین: ارے بھائی وہ الگ کہانی ہے... چچا انعام الحق تو اُنہیل میں اسٹیشن ماسٹر تھے... اُن کے ایک عزیز دوست ہوا کرتے تھے... بدری پرساد جی... ایک دن بدری پرساد جی نے کسی چھوٹی موٹی بات پر چچا سے کہہ دیا... یہ پاکستان نہیں ہے سمجھے... اب یہاں رہنا ہے تو سنبھل کر رہنا... چچا ویسے ہی مارکاٹ کی خبریں سن کر تناؤ میں تھے، اُنہیں لگا کہ اب ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں، چچا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ.. بستر بوریا باندھا اور چل پڑے پاکستان.. .اُن کے چلے جانے کے بعد، ایک دن بدری پرساد جی آئے تھے... اور سر پیٹ رہے تھے... کہہ رہے تھے، "یہ میں نے کیا کر دیا... میں نے غصّے میں کچھ کہا... اور وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا۔"

صابر: آپ بھی تو گئے تھے پاکستان...؟

امین: (اپنی جگہ سے اُچھل کر... غصّے سے)... خبردار... خبردار... (صابر کا گریبان پکڑ کر) یہ بات غلطی سے بھی زبان پر مت لانا...

صابر: (خود کو چھڑاتے ہوئے) گئے تھے تو.... گئے تھے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟

امین: (پریشان لہجے میں) یہ اتنا آسان نہیں ہے.. ویسے بھی میں چچا کے بہکاوے میں آ گیا تھا... وہ بولے تھے... نیا ملک ہے.. کام کے موقع ملیں گے... روزگار ملے گا... ایک گھر وہاں ہوگا.. ایک گھر یہاں ہوگا... پھر جب چاہے آؤ جاؤ۔ اور انعام چچا کی بات مان کر میں

اُن کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن وہاں جا کر دیکھا تو میں حیران... چاروں طرف افراتفری کا ماحول... کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں... تمہیں سوچو چالیس ہزار کی آبادی والا کراچی شہر راتوں رات چالیس لاکھ کی آبادی والا شہر بن گیا۔ ہفتے بھر تک اس بھیڑ میں دھکے کھاتا رہا... میں اندر سے بیحد بے چین تھا... لیکن میں چچا کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ ایک شام میں کراچی کے سمندر کنارے یہی بیٹھا سوچ رہا تھا، کہ میں ایک ہرا بھرا، رنگ برنگا گلستاں چھوڑ کر، اس جنگل میں کیوں آ گیا، اپنے ملک میں تپتی دھوپ تھی تو گل موہر کا سایہ بھی تھا، ہر زخم کا مرہم تھا، اپنے آنگن میں ہم کتنے محفوظ تھے... کتنے مہینے سال دبے پاؤں آئے اور گزر گئے، یہاں ہر پل آپ کا کالر تھامے ہوئے ہے، ہر لمحہ آئینے کی طرح آپ کا منہ چڑا رہا ہے۔ اُسی وقت میں نے اُس بنواس سے آزاد ہونے کا فیصلہ کیا۔ یقین مانو، وہیں سے ایک پوسٹ کارڈ چچا کے نام روانہ کیا اور اُلٹے پاؤں چل پڑا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں آج بھی قانون کی نظر میں مجرم ہوں... کیونکہ میں وہاں... بغیر ویزا پاسپورٹ گیا تھا، اس لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ خاموش رہو... خدا کے لیے خاموش رہو۔

صابر: لیکن جب ویزا پاسپورٹ تھے ہی کہاں...؟

امین: یہ سب بہانے بازیاں ہیں، اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ تم معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ جانتے ہو نہ کہ میں سرکاری ملازم ہوں... اگر ذرا سی بھی بھنک کسی کو لگ گئی تو میں برخواست کر دیا جاؤں گا... جیل میں ڈال دیا جاؤں گا....۔ **(امین پاؤں پٹکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)**

صابر:... ارے سنئے تو **(امین بتانے آگے بڑھ جاتا ہے)**

(صابر دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ جاتا ہے۔ تبھی خانم پانی کا گلاس لے کر آتی ہے۔ صابر اُٹھ کر پانی پیتا ہے اور پھر لیٹ جاتا ہے۔ خانم بتی گل کر دیتی ہے۔ تبھی کوئی زور سے دروازہ بھڑ بھڑاتا ہے۔)

بتاشی: صابر میاں...! جلدی کرو....

(صابر اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے بتاشی پریشان حال کھڑی ہوتی ہے) 'بتاشی آپا...؟

بتاشی: امین میاں کو دل کا سخت دورہ پڑا ہے... اُنہیں فوراً اسپتال پہنچانا ہے... جلدی۔ (صابر ہکا بکا کھڑا رہ جاتا ہے)۔

□ □ □
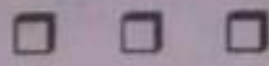
سین نمبر سات

(ایک عمارت کے دروازے پر "ضلع اسپتال" کا بورڈ۔ اسپیشل وارڈ کے سامنے بڑا سا لان ہے، وہاں لوگ الگ الگ گروپوں میں کھڑے ہیں)

بنواری: کل رات 10 بجے تو بابو جی ہماری دکان پر آئے تھے، پان اور بیڑی لینے، ہم نے اُن سے پوچھا تھا کہ بابو جی سب ٹھیک تو ہے نا؟ اُنہوں نے کہا بھی تھا، ہاں بنواری سب ٹھیک ہے، پھر صبح اُٹھتے ہے پتا لگا تو میں دوڑا..."

مولانا سراج: (اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے) ہاں میاں! اسی کا نام زندگی ہے... کون جانے کب کیا ہو جائے۔

ماسٹر طاہر علی: (ہتھیلی پر تمباکو مل کر داڑھ میں دباتے ہوئے) ابھی میں اسکول سے آیا ہی تھا... سوچ رہا تھا کہ سائیکل باہر چھوڑ دوں... یا اندر رکھوں... کیونکہ اگر کہیں جانا پڑا تو سائیکل پھر باہر نکالنا پڑے گی... اسی پس و پیش میں تھا کہ سامنے سے بھائی جان کو تیزی سے آتے دیکھا... میرا ماتھا ٹھنکا... لگا... ضرور کوئی بری خبر ہے۔

بنواری: (مولانا سراج کو آنکھ مار کر ماسٹر طاہر کی بات کاٹتے ہوئے) بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ماسٹر صاحب... بھائی جان کو دیکھ کر آپ کو کیسے لگ گیا کہ بری خبر ہے؟"

ماسٹر طاہر: (چڑھ کر) ارے تم کیا جانو... چھٹی حس... سکستھ سینس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے...

(مولانا اور بنواری مسکراتے ہیں تبھی صابر اسپتال کے کمرے سے باہر آتے ہیں)

صابر: (بلند آواز میں) سنئے... (سب لوگ صابر کے قریب پہنچے ہیں) امین صاحب کی حالت اب
خطرے کے باہر ہے... ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اُنہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ تو
آپ سے گزارش ہے کہ آپ اطمینان سے اپنے گھروں کو جائیں۔

ایک آدمی: ارے بھائی ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتاؤ...

صابر: (سمجھاتے ہوئے) ضرورت پڑے گی تو... آپ کو خبر کردی جائے گی۔

(اسپتال میں شام کا منظر)

(بیچ لان میں روشنی کے لیے لیمپ رکھا گیا ہے۔ ایک طرف بنواری اور ماسٹر طاہر بیٹھے ہیں، اُنہیں کے قریب کچھ لوگ تاش کھیل رہے ہیں، تو کچھ کیرم کھیل رہے ہیں۔ قریب میں ایک خاندان دسترخوان بچھا کر کھانا کھا رہا ہے)

بنواری: (کیرم بورڈ پر گوٹیاں جماتے ہوئے) دن میں تو اپنی دکان چھوڑ نہیں سکتے، اس لئے دکان
بند کی اور آگئے بابو جی کے پاس...."

ماسٹر طاہر: "اسکول سے نکلا تو سوچا گھر چلوں... پھر خیال آیا کہ گھر جاؤں... وہاں سے ٹیوشن
پڑھانے جاؤں پھر گھر جاؤں گا...."

بنواری: (بات کاٹ کر) مطلب یہ ہوا کہ آپ اسکول سے نکلے ٹیوشن پڑھائی اور یہاں آگئے۔

ماسٹر: (تنگ کر) تم بات کاٹتے کیوں ہو؟ میری بات پوری سنتے کیوں نہیں ہو؟

بنواری: (ہنس کر) اگر آپ کی بات پوری ہونے کا انتظار کریں گے تو زندگی گزر جائے گی۔

(تاش کی ٹیم)

مرزا جی: (تاش پیس کر پتے بانٹ رہے ہیں، منھ میں بیڑی دبی ہے)

ایک آدمی: (دوسرے آدمی سے) اپنے مرزا جی کرکٹ بھی زبردست کھیلتے تھے... سلامی بلّے باز
تھے... سلامی بلّے باز...

مرزا جی: (بیڑی کا کش لگاتے ہیں، تاش جماتے ہوئے) اوپنگ بیٹسمین اور وکٹ کیپر، ارے جو

جلوے فرخ انجینئر کے تھے نہ وہی اپنے تھے۔

دوسرا آدمی: (**مزہ لیتے ہوئے**)...میں نے دیکھا تھا ایک دن انہیں کرکٹ کھیلتے ہوئے...کالی پینٹ...لال شرٹ... پاؤں میں چپل...ایک پاؤں پر پیڈ، دوسرا خالی، سر پر کیپ، گلے میں رومال، کالا چشمہ اور منھ میں بیڑی...اگر ڈان بریڈ مین انہیں دیکھ لیتا تو کرکٹ سے توبہ کرلیتا۔(**پہلا آدمی ہنستا ہے اور مرزا جی مسکراتے ہیں**)

پہلا آدمی: (**ہنستے ہوئے**) ہاں مرزا جی، بمبئی کب جارہے ہو، کوئی نئی فلم ولم؟

مرزا: (**سنجیدگی سے**) بس پرسوں روانگی ہے، (**بیڑی کا گہرا کش لے کر**) رول تو بہت مل رہے ہیں... لیکن اپنے کو پسند آئے تب نا...

دونوں آدمی: اچھا...!

مرزا جی: (**فخر سے**) ابھی دلیپ صاحب کے ساتھ رول مل رہا تھا..اپن نے منع کردیا۔

دونوں آدمی: (**تعجب سے**) دلیپ صاحب کے ساتھ..اور منع کردیا...کیوں بھئی؟

مرزا جی: اصل میں سین یہ تھا کہ رات کا وقت ہے...میں اندھیری گلی میں چھپ کر دشمن کا انتظار کر رہا ہوں...اتنے میں قدموں کی آہٹ کی آواز آتی ہے...جیسے ہی وہ آدمی قریب آتا ہے میں اُس کے منھ پر گھونسا جڑ دیتا ہوں وہ نیچے گر جاتا ہے...لیکن جیسے ہی میری نظر اُن کے چہرے پر پڑتی ہے...میں ہکابکا...پتا ہے وہ کون تھا...دلیپ صاحب!

دوسرا آدمی: آپ کو یہ رول کرنا تھا بھائی...

پہلا آدمی: مرزا جی آپ نے غلطی کردی۔

مرزا جی: نہیں بھائی...نہیں... اتنے عظیم کلاکار پر ہاتھ اُٹھائیں... یہ اپنے ضمیر کو گوارا نہیں ہوا۔(**دونوں آدمی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں، تبھی مرزا قریب میں بیٹھے خاندان کی طرف دیکھ کر پکارتے ہیں**)

مرزا جی: اور جمیل میاں، پکنک من رہی ہے۔

جمیل: نہیں بھائی... بھائی صاحب کی طبیعت پوچھنے آیا تھا...گھر سے ہو کر آتا تو کافی دیر ہو جاتی...

اس لئے آپ کی بھابھی نے کہا کہ کھانے یہاں لے آئیں...اب بھائی صاحب کے
یہاں حاضری بھی ہوگئی...

مرزا جی: بنّے میاں دکھائی نہیں دئے آج...

جمیل: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ارے ہاں... بھائی صاحب... کے پاس کے کمرے والا جو مریض ہے
نا... اُس کا کل صبح آپریشن ہے... اس کے لئے خون دینے گئے ہیں..

مرزا جی: اور شمن میاں...

جمیل: وہ بھی کسی مریض کی دوا لینے کے چکر میں دوڑ رہے ہیں۔ (**تبھی صابر اور ڈاکٹر دوبے
برآمدے میں دکھائی پڑتے ہیں**)

ڈاکٹر دوبے: (**صابر سے، غصّے میں**) دیکھئے آپ کا مریض اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے...
صرف 36 گھنٹے ہی تو گزرے ہیں.. اُنہیں دل کا دورہ پڑے۔ میں دیکھ رہا ہوں یہا
ں مہمان آرہے ہیں، آؤ بھگت ہو رہی ہے... ارے بھائی یہ اسپتال ہے... ہوٹل نہیں۔

صابر: (**سہمے انداز میں**) ڈاکٹر صاحب ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر دوبے: (**غصّے میں**) کیا کوشش کر رہے ہیں؟... ابھی ابھی میں نے دیکھا... کوئی مہمان آئے
تھے اور امین، کھڑے ہو کر اُن سے گلے مل رہے تھے... آؤ بھگت ہو رہی تھی... (**اتنا کہہ
کر ڈاکٹر دوبے آگے بڑھتے ہیں۔ صابر اپنی جگہ خاموش کھڑے رہتے ہیں، لیکن کچھ دور
جا کر ڈاکٹر دوبے واپس آتے ہیں**)

ڈاکٹر دوبے: (**صابر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر**) مسٹر امین جب یہاں آئے تھے... تب اُن کی
حالت بہت نازک تھی... اُن کا بچنا مشکل لگ رہا تھا... پھر اُن کی حالت بہت تیزی
سے سدھری... ظاہر ہے دواؤں نے اپنا کام کیا ہوگا... لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ سب
سے زیادہ کام اُن کے will power نے کیا ہے... اس لئے میں سوچتا ہوں... وہ
جو بھی کر رہے ہیں... اُنہیں کرنے دیا جائے۔

(**اتنا کہہ کر ڈاکٹر دوبے آگے بڑھ جاتے ہیں اور صابر اُنہیں حیرانی سے**

دیکھتا رہ جاتا ہے)

سین نمبر آٹھ

(امین کا ڈرائنگ روم۔ امین سوفے پر بیٹھے ہیں، چہل پہل کا ماحول۔
لوگ امین کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال رہے ہیں۔)

جمیل: (بتاشی سے) آپ کو بھائی صاحب کا غسل صحت مبارک ہو... یقین مانئے اللہ کا کرم رہا...
موت کے منھ سے واپسی ہوئی ہے۔

بتاشی: سچ کہہ رہے ہیں... اوپر والے کی بڑی مہربانی رہی ہے۔

ماسٹر طاہر: (امین کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہوئے) بھائی صاحب سچ مانئے... آپ کی خبر سن کر میرا بھی دل بیٹھنے لگا تھا... گھبراہٹ ہوئی تو پہلے سوچا وید جی کے پاس جاؤں... لیکن پھر خیال آیا کہ وید جی کا علاج لمبا پڑ جائے گا... معاملہ دل کا ہے تو کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے... ابھی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے نکلا ہی تھا... سامنے سے حکیم صاحب آتے دکھائی پڑے...

بنواری: (بات کاٹتے ہوئے) ماسٹر صاحب بس اتنا بتاؤ کہ اب طبیعت ٹھیک ہے نا۔

ماسٹر طاہر: (چڑھ کر) پھر تم بیچ میں کودے۔

بنواری: ہمیں بھی بابو جی سے ملنے دو۔ (بنواری امین کے گلے میں ہار ڈالتا ہے۔ امین اُسے گلے لگا کر دُعائیں دیتا ہے) جیتے رہو... جیتے رہو...

ماسٹر طاہر: (بنواری سے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حکیم صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فوراً کہا، ماسٹر طاہر آپ پان سگریٹ فوراً چھوڑ دیں... یہ چیز بدن میں خشکی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی پڑ جاتی ہے... لہٰذا دل کی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

بنواری: یعنی آپ تمبا کو چھوڑ رہے ہیں؟

ماسٹر طاہر: پوری طرح تو نہیں... پر کوشش کر رہا ہوں... اور میں امین بھائی صاحب کو بھی یہی صلاح

دوں گا کہ بیڑی۔سگریٹ چھوڑیں اور زیادہ ہی طلب لگے تو سونف الا ئچی سے کام

چلائیں۔

بنواری: (قہقہہ لگا کر) مطلب یہ کہ طلب لگے چائے کی تو شربت بنا کر پی لو...واہ ماسٹر صاحب

واہ...آپ کو معلوم ہے بیڑی سگرٹ کے بل پر ہی بابو جی نے اتنی لمبی زندگی پائی ہے...

آپ تو میری دکان ہی اُٹھوانا چاہتے ہیں۔

(صابر اور خانم آتے ہیں۔ امین اور بتاشی کے ساتھ ہی بنی بھی بجی دجھی

کھڑی ہے۔ بنی اشارے سے کچھ پوچھتی ہے اور خانم اس کی بات سمجھتے

ہوئے جواب دیتی ہے)

خانم: ذیشان...؟ (بنی ہاں میں سر ہلاتی ہے)

خانم: وہ بھی یہیں کہیں ہوں گے۔ (صابر امین کے گلے میں ہار ڈالتے ہیں، دونوں گلے ملتے ہیں)

خانم: (مٹھائی کا ٹکڑا امین کے منھ کی طرف بڑھاتے ہوئے) بھائی صاحب اس ایک مٹھائی میں دو

خوشیاں جڑی ہوئی ہیں...

امین: دو خوشیاں...ارے واہ...

خانم: ایک تو آپ کا غسل صحت۔

امین: اور دوسرا۔

خانم: ابھی ابھی کراچی سے خبر آئی ہے کہ ایاز میاں کی شادی ہوگئی...تو لیجئے۔

امین: واہ بھئی واہ...بہت بہت مبارک ہو...یعنی آج تو ایسا لگ رہا ہے جیسے خوشیوں کا موسم آگیا

ہو۔ (مٹھائی کھاتا ہے)

(تبھی بنی کا چہرہ فق پڑ جاتا ہے۔ وہ وہاں سے چل کر اسٹیج پر آگے آتی ہے۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ پھر وہ ہچکیوں سے رونے لگتی

ہے۔ روتے روتے ہی وہ اپنے ہاتھ کی چوڑیاں اُتارتی ہے اور اُنہیں

زمین پر پھینک کر توڑتی ہے...اُس کے چہرے پر نا اُمیدی، دُکھ اور تناؤ

کے تاثر ہیں... بنی بھاری قدموں سے آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ تبھی پچاس برس کی ایک عورت اپنی پندرہ سال کی بیٹی کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ دونوں بنی دھجی ہیں)

خانم: (اُنہیں دیکھ کر بتاشی سے) یہ کوٹھے والی... یہ آج کہاں راستہ بھول گئی...؟

بتاشی: اب بھئی.. خاندانی رشتے ہیں... بھائی کا سنا ہوگا تو چلی آئی۔

(منّی بائی اور اُس کی بیٹی جھک کر امین کو آداب کرتے ہیں۔ پھر منّی بائی اُنہیں پھول کا ہار دیتی ہیں)

منّی بائی: مالک کا شکر ہے... کہ آپ صحت پا کر گھر لوٹے... اوپر والا آپ کو اور اچھی صحت دے... آپ کی عمر دراز کرے...۔ (پھر اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کر کے) یہ آپ کی ہی بیٹی ہے شجّو۔

امین: ماشااللہ... بڑی پیاری بیٹی ہے۔

منّی بائی: آپ کی دُعا سے، جتنی پیاری دِکھتی ہے، اُتنی پیاری آواز بھی پائی ہے... ابھی اس نے محفل میں قدم نہیں رکھا ہے... میں چاہتی ہوں کہ سب سے پہلے اسے آپ کی نیک خواہشات ملیں، اگر اجازت ہو تو۔

امین: ارے کیوں نہیں... ضرور۔

(شجّو امین کے ساتھ فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ منی بائی اُسی کے پاس ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ گانا شروع کرتی ہے۔)

کوفت سے جان لب پر آئی ہے

ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل سے نزدیک اور اِتنا دور
کس سے اُس کو، کچھ آشنائی ہے
جس مرض میں کے جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دیوانے نے موت پائی ہے

(اسی کے ساتھ کمرے کی کھڑکی میں بنی کا چہرہ دکھائی پڑ رہا ہے۔ جو اُداس چہرہ لیے کھڑی ہے۔ وہ کچھ دیر گانا سنتی ہے اور پل دو پل بعد، غصّے سے کھڑکی کے پلّے بند کر دیتی ہے۔ ممّو کا گانا تھوڑی دیر اور چلتا ہے۔ تبھی چاندنی دوڑتے ہوئے آتی ہے)

چاندنی: (روتے ہوئے) بنی آپا نے... بنی آپا نے خودکشی کر لی۔ (چاندنی روتے روتے وہیں بیٹھ جاتی ہے)

بتاشی: اللہ میری توبہ... (بتاشی، خانم، امین اور صابر) اندر دوڑتے ہیں... چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے)

سین نمبر نو

(بتاشی، دو چار عورتوں کے بیچ بیٹھی ہے۔ غم کا ماحول ہے)

بتاشی: (ایک ٹھنڈی آہ بھر کر) بنی کو ایک دن جانا تھا، وہ چلی گئی۔ نام تھا بنی... لیکن بنی.... بنی نہیں بن پائی... دلہن نہیں بن پائی... مجھے یاد ہے بچپن میں، گڈا، گڈی کے کھیل میں بچوں نے بنی اور ایاز کی شادی رچا دی۔ بنا۔ بنی کا یہ کھیل تو ختم ہو گیا لیکن بنی نے اُسے

حقیقت سمجھ لیا... اُسی کا اپنا مقدر سمجھ لیا... اور ستیاناس ہو اس بٹوارے کا جس نے بنی-بنے کو بانٹ دیا۔ ایاز اپنے چچا کے ساتھ پاکستان چلا گیا اور بنی اُس کی یاد میں تڑپتی رہی... پھر قسمت کی ستم ظریفی... کہ اُس کے پاس زبان بھی نہیں تھی... وہ کیا سوچتی رہتی تھی... اس پر کیا بیتتی تھی... کسی نے دھیان نہیں دیا... جہاں چیخنے والوں، نعرے بازوں کی کوئی نہیں سن رہا... وہ تو بے زبان تھی۔ (اتنا کہہ کر بتاشی کھڑی ہو کر آگے بڑھتی ہے)

''میں پوچھتی ہوں... پاکستان بنا، بٹوارہ ہوا تو کون بٹا... ہندوستان-پاکستان کے آسمان کا رنگ تو وہی ہے، ہواؤں، فضاؤں کا عالم یہی ہے، سمندر کا پانی وہی ہے، دریاؤں کی کل کل وہی ہے، سورج کی تپش وہی ہے، چاند کی چاندنی وہی ہے۔

تو پھر بٹا کون؟

میں پوچھی ہوں، بٹا کون؟

انسان بٹے، انسانیت بٹی

جذبات بٹے، ذہن بٹے

اور

بنی جیسے معصوموں کے

خواب بٹے، خواہشیں بٹی

□ □ □
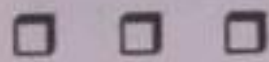
سین نمبر دس

(امین کا ڈرائنگ روم۔ امین، صابر (عمر 53-52) اور بتاشی بیٹھے ہیں۔ بتاشی سر پر دوپٹا اوڑھے کچھ پڑھ رہی ہے۔ امین کرسی، ٹیبل پر بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ صابر کی نظریں اخبار پر ٹکی ہیں)

بتاشی: پاکستان سے آنے والوں کی تو باڑھ آگئی ہے۔ جو دیکھو آٹھ-آٹھ، دس-دس بچوں کی ٹیم
کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ اور اوپر سے ہر شخص کا طرہ یہ کہ ''ہم تو پہلی بار آئے ہیں۔''
بھائی دعوتیں کر کر کے تو اپنی تو کمر ٹوٹ گئی اور ہمارے بٹوے کا دم ٹوٹ گیا ہے۔

صابر: **(مسکرا کر بتاشی سے)** آپ تو تیرہ سالوں سے تڑپ رہی تھیں سب سے ملنے کو...۔

بتاشی: جن کے لئے تڑپ رہے ہیں، وہ تو اب تک کہیں بدلیوں میں چھپے ہوئے ہیں...

امین: **(ایک گہری سانس لے کر)** 1965 سے لے کر آج تک 1978 تک ہمارے اپنوں کو خبر
بھی افواہوں کی طرح ہوا میں تیر کر آتی تھیں... فلاں دنیا میں نہیں رہا... فلاں کی شادی
ہوگئی... بس۔

صابر: 1965ء کی جنگ کے بعد اُمید جاگی تھی کہ حالات بہتر ہوں گے، لیکن 1971 کی جنگ
ہوئی... ایک قوم دو حصوں میں بنٹ گئی... بنگلہ دیش کا جنم ہوگیا... اُس کے بعد تو میں
پاکستان سے دوستی کی اُمید چھوڑ چکا تھا، یہ تو بھلا ہو جنتا پارٹی کا جو آج ہم مل تو رہے
ہیں...

امین: **(پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر)** پاکستان ٹوٹ گیا... سیاست کے نام پر ایک قوم دو حصوں میں
بنٹ گئی... میں تو یہی سوچتا ہوں کہ اُن رہنماؤں کی روحوں پر کیا بیت رہی
ہوگی... جنہوں نے ''دو قوم... دو ملک'' کا نعرہ دے کر ملک کو بٹوا دیا تھا۔''

بتاشی: بھائی صاحب اب یہ بحث چھوڑیے اور اگر کسی کی پہنچ ہو تو بھیا سرحدوں پر دوبارہ تالے پڑوا
دے...'' **(تبھی ایک ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے جس کا نام چرونجی ہے۔)**

چرونجی: **(سب کا سلام کرتی ہے)** سلام علیکم... بتاشی آپا... کون سی سرحد پر تالے پڑوا رہی ہو؟

بتاشی: چرونجی... یہی ہندوستان پاکستان کی سرحد پر...

چرونجی: خدا کے لیے ایسا نہ کرو... **(شادی کا کارڈ آگے بڑھاتے ہوئے)** آپ کی بیٹی بلقیس کی
شادی طے ہوگئی ہے، اگلے ہفتے کراچی سے بارات آرہی ہے۔

بتاشی: **(تمک کر)** ارے چرونجی تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا... اپنی پھول سی بیٹی کو تم پاکستان

میں بیاہ رہی ہو... تمہیں پتہ ہے... کب جنگ ہوگی... کب سرحدوں پر اندھیرا چھا جائے گا... تم اپنے جگر کے ٹکڑے کا چہرہ دیکھنے کو ترس جاؤ گی، آواز سننے کو تڑپو گی تم... سمجھی۔ تمہیں یاد ہے نہ فرحت کی بیٹی کی شادی، پندرہ سال بیت گئے۔ بیٹی وہاں تڑپ رہی ہے ماں یہاں آنسوں بہا رہی ہے۔

چھَدونجی: (صبر سے) آپا، تم تو جانتی ہو نہ کہ بلقیس کے تایا وہاں ہیں، چچا وہیں ہیں، پھوپھی وہیں ہیں، خالہ وہیں ہیں... اُن کے سب کے بچے جوان ہو چکے ہیں... اب جنگ چھڑے... آگ لگے... بھونچال آئے... خون کے رشتوں کو تو نہیں بھلایا جا سکتا... اپنی آنکھ، ناک، دھڑکن اور سانس کو کون بھول سکتا ہے۔ رشتوں کے تانے بانوں کو تو قائم رکھنے ہوں گے، پرانے تاروں سے نئے تار جوڑنے ہوں گے۔" (اُٹھتے ہوئے) بلقیس کے نکاح میں ضرور آنا ہے۔

(چھدونجی باہر چلی آتی ہے۔ اور رتنا شی، امین اور صابر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ گانے والوں کی ٹیم داخل ہوتی ہے)

چھاتی جلا کرے ہے، سوز و دروں بلا ہے
اِک آگ لگ رہی ہے، کیا جانئے کیا ہے
میں اور تو ہیں دونوں مجبور طور اپنے
پیشہ تیرا جفا ہے، شیوا میرا وفا ہے
روحِ سخن ہے کدھر، اہلِ جہاں کا یا رب
سب متکِف ہیں اس پر، ہر ایک کا خدا ہے
شادی سے غم جہاں میں، دیکھ چند ہم نے پایا
ہے عید اِک دن، تو دس دن یہاں رہا ہے

□ □ □
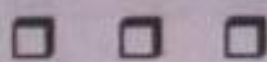
سین نمبر گیارہ

(امین کا ڈرائنگ روم، امین سفر کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ صابر امین سے باتیں کر رہے ہیں، بتاشی آپا امین کا سوٹ کیس جما رہی ہیں، تینوں کی عمر 65-70 سال)

امین: ''یقین نہیں آ رہا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں... میرا ضمیر اب بھی میرے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لیے کھڑا ہے...''

صابر: ''میں کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ کو ضرور جانا چاہیے، پھر وہ ترکستان ہو یا پاکستان... اور اب آپ ریٹائر ہو چکے ہیں تو سرکاری نوکری کا ٹینشن بھی ختم ہو گیا... ایک بات اور سنو... یہ ہندوستان- پاکستان کا بٹوارہ کیا تم نے یا میں نے کروایا تھا... جو اس کے ذمہ دار تھے، وہ تو سب جنت سدھار گئے اب تم ہندوستان- پاکستان کی اُلجھن کا دل سے نکال دو... اس ملک میں ہمارا حق بھی اُتنا ہی ہے، جتنا اوروں کا ہے۔ ہم بھی اسی مٹی سے اُگے پودھے ہیں، ہم بے وفا کیسے ہو سکتے ہیں... ہم تو زیادہ وفادار ہیں... ہمارے پاس تو ملک چھوڑ کر جانے کا موقع تھا... لیکن ہم اپنی مٹی، اس مٹی کی سوندھی سگندھ... اپنی جڑوں اور ان سے جڑے جذبات کو ٹھکرا کر نہیں گئے... ہم نے اپنے بزرگوں کی روحوں سے رشتہ نہیں توڑا... ہم بھی اتنے ہی ہندوستانی ہیں... جتنے ملک کی دوسری عوام۔

امین: ہاں بھائی... پوری زندگی گذر گئی انتظار میں کہ دونوں ملکوں کے رشتے بہتر ہوں تو بو بو سے ملا جائے... چچا سے ملاقات ہو...۸۷-۷۷ کے بعد رشتے بہتر ہوئے تو بابری مسجد کا بوال کھڑا ہو گیا... پھر کارگل ہو گیا۔

صابر: ہندوستان- پاکستان کے رشتے تو موسمی بخار کی طرح ہے۔ کروسین دی تو اُتر گیا... دوا کا اثر ختم ہوتے ہی پھر چڑھ گیا... اسی لئے کہہ رہا ہوں امین میاں جلدی سے ہو آیئے... ورنہ پتہ نہیں کب ان رشتوں کا دوبارہ بخار چڑھ جائے۔

امین: (سنجیدگی سے) میں کراچی جا تو رہا ہوں، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دل کا مریض ہوں... دیکھو... اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو ہرگز، ہرگز مجھے وہاں مت دفنانا... میں ہر قیمت پر قبرستان مولانا صاحب میں ہی دفن ہونا چاہوں گا (کہتے کہتے امین کی آواز بھرا گئی)

صابر: (مسکرا کر) ''قبرستان، مولانا صاحب ہی کیوں، شہر میں اور بھی تو قبرستان ہیں؟''

امین: (ایک گہری سانس چھوڑ کر) ''ایک تو یہ کہ دادا وہاں ہیں، ابا وہاں ہیں، امی وہاں ہیں... خاندان کے تمام بزرگوں کی روحیں وہاں ہیں... پھر اُس جگہ میں بڑی کشش ہے... شپرا کے ایک کنارے پر سادھو سنتوں کی عبادت کے سائے میں ڈھکا دت کا اکھاڑا، دوسری طرف کالے پتھروں سے بنا صاف ستھرا رام گھاٹ، شپرا کے کل کل بہتے پانی پر جب صبح کی پہلی کرن اپنی کشتی اُتارتی ہے تو لگتا ہے جیسے فردوس بذاتِ خود زمیں پر اُتر آئی ہو، اس کے علاوہ سرمئی پتھروں سے بنے قدیمی مندروں کے درمیاں مولانا صاحب کی درگاہ کا سفید گنبد، مجھے بیش قیمتی انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی طرح لگتا ہے۔ مندروں کی گھنٹیوں کی ساتھ گتھی ہوئی صبح کی اذان کی آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی روح کی تہوں تک پہنچ جاتی ہے... میرا یہی ماحول میرا شہر میری روح ہے، مرنے کے بعد بھی میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ مرنے کے بعد۔

صابر: (امین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے... ارے آپ اپنوں کے بیچ جا رہے ہیں... خوشی خوشی جایئے۔ (بتاشی آگے بڑھ کر امین کا ہاتھ، ہاتھ میں لیتی ہے)

سین نمبر بارہ

(صابر اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ تبھی بتاشی ہاتھ میں لفافہ لے کر داخل ہوتی ہے)

بتاشی: بھائی صاحب کا خط آیا ہے کراچی سے۔

صابر: (بتاشی کے ہاتھ سے خط جھپٹتا ہے، کچھ لائنیں پڑھنے کے بعد اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے) کراچی پہنچ کر کتنے خوش ہیں امین۔

بتاشی: بھئی... ذرا زور سے پڑھو... ہمیں بھی تو پتہ چلے...

صابر: (خط پڑھتا ہے) جب میں بشارت ماموں سے ملنے پہنچا تو یہ خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے تھے... لگتا جیسے پوری مرزا واڑی... کیا پورا اجین اُن کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ہو۔

سین نمبر تیرہ

(فلش بیک کراچی)

(ایک خوبصورت ڈرائنگ روم ہے۔ جس نے ایک طرف جناح کی بڑی تصویر لگی ہوئی ہے۔ امین اور بشارت ماموں، عمر کوئی 80 سال پہلے، بیٹھے ہوئے ہیں)

بشارت ماموں: مرزا واڑی میں پانچ نیم کے بڑے بڑے پیڑ ہوا کرتے تھے، ایک مسجد میں، ایک بڑی ڈیوڑھی، ایک چھوٹی ڈیوڑھی، ایک حویلی اور ایک پیچھے کی طرف۔

امین: پانچ نہیں اب چار ہیں... پیچھے والا اب نہیں ہے۔

بشارت: وہ پنگھٹ کے پاس لمبا سا کالا پتھر لگا تھا...؟

امین: (مسکرا کر) وہ اب بھی، ویسا ہی ہے۔

بشارت: اور وہ مادھو کالج میں، کینٹین کے پاس ایک چمپا کی بڑی بیل تھی۔

امین: وہ بھی ہے... لیکن ماموں آپ پاکستان میں رہ کر بھی اوجین میں جی رہے ہیں... تو آپ یہاں آئے کیوں؟

بشارت: (سنجیدگی سے) میں نے خود کبھی سوچا نہیں تھا... (پھر یادوں میں کھوتے ہوئے) میں تب انٹر میڈیٹ میں پڑھ رہا تھا... ایک دن کوئی لیڈر کالج میں آئے ہوئے تھے... اُنہوں

نے اتنی گاڑھی ہندی میں تقریر کی کہ مجھے ایک لفظ پلّے نہیں پڑا۔ اُس رات میں سو نہیں پایا... دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ اگر اس ملک میں یہی زبان چلے گی تو ہمارا کیا ہوگا؟ بس اُسی دہشت میں پاکستان آ گیا... لیکن یہاں آ کر لگا... آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے... لیکن کر بھی کیا سکتے تھے... بے بس تھے... جلیے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح۔"

امین: لیکن آپ تو آئی. جی. پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں...؟

بشارت: ہاں... کیریر کے سفر کا انجام تو یہی ہوا۔ لیکن آغاز بہت خطرناک تھا... بیحد تکلیف دہ... جب کراچی پہنچا تو چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا... ایسا لگا جیسے حضرت آدمؑ کو جنت سے اُٹھا کر زمین کی طرف پھینک دیا گیا ہو... کراچی شہر کے باہر-قصبہ علاقہ میں ایک جھونپڑی سے زندگی کی شروعات کی... جیسے تیسے... محکمۂ خوراک میں کلرکی ملی... لیکن بے چین تھا... جانتا تھا... طوفان نے مجھے کنارے سے بہت دور پھینک دیا ہے... اور بہاؤ کے خلاف تیر کر کنارے تک پہنچنا آسان نہیں تھا... لیکن میں لگا رہا Administrative Services کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گیا... لیکن کسی دل جلے ساتھی نے شکایت کر دی کہ میں نے بنا دفتر کی اجازت کے امتحان دیا تھا... نیا نیا ملک تھا... نہ قانون نہ قاعدے... پھر بھی میرا امتحان رد کر دیا گیا... اور مجھے سزا کے طور پر ہمیشہ کے لیے ڈبار بھی کر دیا گیا۔ لیکن میں Police Services کے امتحان میں بیٹھا اور اللہ کے کرم سے اوّل نمبر رہا۔

امین: لیکن اس دوران کبھی انڈیا آنے کا دل نہیں کیا۔

بشارت: دل تو بہت کیا... لیکن پاکستان پولیس میں رہ کر انڈیا جانے کی بات تو دور... انڈیا کے بارے میں سوچنا تک گناہ ہے... اس لئے ہر خواہش کا... ابارشن کرتے چلے گئے...

(گانے والوں کی ٹیم داخل ہوتی ہے)

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کے بہاراں ہے

پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادوباراں ہے
رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہیں، جیسے شراب چُواتے ہیں
آگے ہو ے خانے کے نکلو، عہدِ بادا غساراں ہے
عشق کے میداں داروں میں بھی، مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اٹھانا، کارِ کارگذاراں ہے
چلتے ہو جو چمن کو چلیے...

(فلش بیک ختم)

سین نمبر چودہ

صابر: (خط پڑھ رہا ہے) ماموں نے قاضی صاحب کے قبرستان کے بارے میں پوچھا تھا۔ لیکن میں نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھتا کہ ہمارا خاندانی قبرستان اب بک چکا ہے اور اُس جگہ ایک خوبصورت 'ڈپٹیل کالونی' بن چکی ہے۔ اور ہاں اپنا وعدہ یاد رکھنا، میں ہر قیمت پر مولانا صاحب والے قبرستان میں ہی دفن ہونا چاہوں گا۔" (خط بند کرتا ہے) "میں نے امین میاں کو پہلی بار اتنا خوش محسوس کیا ہے... خدا کا شکر ہے...." (صابر اُٹھ کر ٹی.وی آن کرتا ہے)

ٹی.وی۔اینکر: ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ پارلیمنٹ پر دہشت گردوں نے حملہ بول دیا ہے۔ اس حملے میں شامل چاروں پاکستانی دہشت گردوں کو مار گرایا گیا ہے۔ سبھی بڑے شہروں میں ریڈ الرٹ جاری کر دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم نے دہشت گردی حملوں کا مقابلہ کرنے والے جاں بازوں کی تعریف کرتے ہوئے سخت لفظوں میں پاکستان کو وارننگ بھی دی ہے۔" (صابر اپنا ماتھ پکڑ کر صوفے میں دھنس جاتا ہے)

بتاشی: اے خدایا... یہ کیا ہوا؟

❑ ❑ ❑
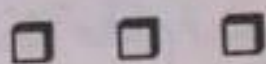
سین نمبر پندرہ

(صبح کا وقت ہے۔ صابر کے ہاتھ میں چائے کا کپ ہے اور سامنے اخبار پھیلے ہیں، جس میں پارلیمنٹ پر حملے کی خبر سرخیوں میں چھپی ہے۔ حملہ آوروں کے مارے جانے کی، مارے گئے شہیدوں کی، ساتھ ہی یہ بھی کہ ہندوستان نے پاکستان سے بھی طرح کے تعلقات توڑ لیے ہیں۔ ہوائی جہاز، بس، ٹرین سب بند... ہو چکی ہیں۔ تبھی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور وہ دوڑ کر فون اُٹھاتے ہیں)

صابر: ہیلو...

سلیم: خالو... کراچی سے سلیم بول رہی ہوں۔

صابر: سلیم میاں! کیا حال ہیں سب خیریت سے ہیں نا؟

سلیم: خالو بہت بری خبر ہے...

صابر: (چونک کر) ''کیا ہوا؟''

سلیم: امین چاچا نہیں رہے... کل رات اُن کا انتقال ہو گیا۔

صابر: کیا؟ کیا... (صابر پر جیسے بجلی گر پڑی ہو، اُن کی آواز بھرانے لگی۔ ہاتھ سے ٹیلیفون پھسلنے لگا... انہوں نے جیسے تیسے اپنے نڈھال جسم کو کرسی پر ڈالا...)

سلیم: کل رات اچانک اُنہیں دل کا دورہ پڑا... (سلیم کانپتی ہوئی آواز میں) اور رات تین بجتے بجتے..... (سلیم کی آنکھوں میں آنسو پھیل چکے تھے)

سلیم: چچا کو کراچی کے سب سے بڑے اسپتال لے جایا گیا... بڑے بڑے ڈاکٹر موجود تھے... لیکن... (سلیم کی آواز ہچکیوں میں بدل گئی)

صابر: (خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) آخری دم تک چچا کہتے رہے، ''مجھے اپنے گھر بھجوا دو۔ وہ ایک ایک کا ہاتھ تھام کر وعدہ لیتے رہے کہ اُن کا دم جہاں بھی نکلے اُنہیں دفن اُجین کے قبرستان مولانا صاحب ہی میں کیا جائے۔''

صابر:(خود کو سنبھالتے ہوئے) پاکستان روانہ ہوتے وقت امین نے مجھ سے یہی وعدہ لیا تھا۔
ہمیں امین کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے...تم میت کو یہاں لانے کا انتظام کرو... یہا
ں ہم دیکھ لیں گے۔

سلیم:(پریشانی اور لاچاری میں) لیکن کیسے؟ دلّی میں پارلیمنٹ پر حملے کے بعد ہندوستان پاکستان
کی سرحدیں سیل کر دی گئی ہیں..اب نہ سمجھوتہ ایکسپریس ہے...نہ ہی کاروائے امن
نام کی کوئی بس...اور نہ ہی کوئی ہوائی جہاز...زندوں کا جانا ممکن نہیں ہے...تو پھر...

(سلیم کی بات سن کر صابر سکتے میں آجاتے ہیں)

صابر:(خود سے) بے چارے امین میاں...(تبھی اُن کا دس برس کا پوتا نازش کمرے میں داخل
ہوتا ہے)

نازش:(بھولے پن سے) دادا میرے دوست پوچھ رہے ہیں کہ پارلیمنٹ پر مسلمانوں نے حملہ
کیوں کیا؟

(صابر نازش کے سوال سے چونک جاتے ہیں...اور اُس کی طرف غور سے
دیکھے ہیں)

نازش:(ضد کرتے ہوئے) دادا بتاؤ نہ دہشت گرد مسلمان ہی کیوں ہوتے ہیں؟ بتاؤ نا دادا...؟

(صابر گھبرایا ہوا ہے... پریشان ہے اُس کے پاس نازش کے سوالوں کا
کوئی جواب نہیں ہے...فون کو ٹیبل پر رکھ دیتا ہے... بڑی مشکل سے کرسی
سے اُٹھتا ہے، اسٹیج پر آگے کی طرف بڑھتے ہوئے)

صابر:(خود سے) ''یہ چھوٹا سا بچہ ہندوستان پاکستان کی پیچیدہ تاریخ کو کیسے سمجھے گا؟ سیاستدانوں
کی شطرنجی چالیں اس کے ننھے دماغ میں کیسے اُتریں گی...اسے کیسے سمجھایا جائے کہ
سیاست کے دلفریب نقاب کے پیچھے حکومت کا ایک خوفناک چہرہ چھپا ہوتا ہے...اور
اسی کی گندی ذہنیت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے انسان کبھی مسلم لیگی ہو جاتا
ہے، کبھی پاکستانی قرار دے دیا جاتا ہے اور کبھی اُسے دہشت گردی کے کٹہرے میں

کھڑا کر دیا جاتا ہے...

اس چھوٹے بچے کو کیسے سمجھایا جائے کہ سیاست کیا چیز ہوتی ہے...اور سیاست داں، سیاسی لیڈر کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں...میں تو خود آج تک اُنہیں نہیں سمجھ پایا...

کبھی مجھے لگتا ہے رہنما...حکومت کے لالچ اور اقتدار کے نشے میں چور ایک مدمست ہاتھی ہے...جس کا شغل روندنا ہوتا ہے...کبھی خوشیوں کو، کبھی خوبصورتی کو اور کبھی خوشبو کو...

کبھی مجھے لگتا ہے جیسے رہنما کوئی پینٹر ہو...مصور...جو پوری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگا دیکھنا چاہتا ہے...وہ جب چاہے جس کا چہرہ کالے سے سفید اور سفید سے کالا کر دیتا ہے۔

"کبھی مجھے لگتا ہے جیسے سیاست داں ایک جادوگر ہے...جس کی ہتھیلی پر آگ اور پانی، جنگ اور امن، .... بھگوان اور شیطان بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچ رہے ہوتے ہیں...(**صابر پلٹ کر دیکھتا ہے نازش وہاں سے جا چکا ہے، صابر پھر اپنی کرسی پر دھنس جاتا ہے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فون اُٹھاتا ہے**)

سلیم: کچھ تو بولیے خالو...بتائیں ہم کیا کریں...یہاں کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...آپ ہی کچھ بتایئے...

صابر: (**خود کو سنبھالتے ہوئے**) امین کی قسمت میں اب اتجین نہیں ہے...قبرستان مولانا صاحب نہیں ہے...اب اُن کی آخری خواہش پوری کرنی ممکن نہیں ہے...خدا کو یہی منظور ہے...اُس کی یہی رضا ہے...

(**صابر جسم کی تمام طاقت اکٹھا کر کے**) تم لوگ امین کو کراچی کے جس بھی قبرستان میں دفن کرو...کتبے پر اُن کے نام کے ساتھ، پتہ "قبرستان مولانا صاحب اتجین" ہی لکھنا

(**اتنے کہتے کہتے صابر کی آواز گلے میں پھنس جاتی ہے۔فون اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے، گانے**)

والوں کی ٹیم داخل ہوتی ہے)

دیکھ تو، دل کی جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے فلک
شعلہ اِک صبح یاں سے اُٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اُس کو
جو تیرے آستاں سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

(ختم شد)

□ □ □
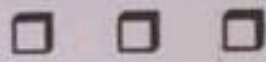
چھوٹی ڈیوڑھی والیاں

سین نمبرا

پرانی حویلی نما مکان کادالان، چھوٹی نانی بچوں کو پڑھارھی ھیں اور ساتھ میں سلائی بھی کرتی جا رھی ھیں۔ ان کے آس پاس دو تین چھوٹے بچے یعنی دو لڑکیاں اور دو لڑکے (عمر نو بارہ برس) بیٹھے ھیں۔ سامنے رحل پر سپارے رکھے ھیں۔ وہ لوگ ہِل ہِل کر پڑھ رہے ھیں۔ نانی کا دھیان کام کی طرف ھے، اس لئے بچے موقع کا فائدہ اٹھا کر شرارت بھی کر رہے ھیں۔ کوئی کسی کا دوپٹا کھینچ رھا ھے تو کوئی کسی کی ٹوپی اچھال رھاھے۔ بیچ بیچ میں وہ ھنس بھی پڑتے ھیں۔ نانی بظاھر سِلائی میں لگی ھیں، لیکن ان کے دل میں کچھ اور چل رھا ھے۔ ان کے چھرے کے تاثرات سے پتہ چل رھاھے جیسے من ھی من میں وہ کسی سے سوال جواب بھی کرتی جا رھی ھیں۔ تبھی ان کا دھیان بچوں کی طرف جاتا ھے۔

چھوٹی نانی: عینک کے اوپر سے جھانک کر

ارے.....ارے.....ارے..... موقعہ ملتے ہی..... ہی ہی..... کرنے لگے.....

سلیم سے

سلیم.....تمہاری ٹوپی کہاں گئی؟

جمیلا: ٹوپی دکھاتے ہوئے

یہ رہی نانی.....

چھوٹی نانی: دانت پیستے ہوئے غصے سے

اگر علم کی بے ادبی کرو گے نہ.....تو شیطان تمہاری ٹوپیاں، دیکھ لینا اسی طرح اُچھالے گا۔

صغرا: نانی

مشتاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

یہ مشتاق نے کیا ہے.....

شرارت سے

میں نے دیکھا تھا اسے.....

چھوٹی نانی ترچھی نگاھوں سے مشتاق کو گھورتی ھیں۔ نانی کو گھورتے دیکھ مشتاق اور زیادہ ہِل ہِل کر پڑھنے لگتا ھے۔

چھوٹی نانی:

چھوٹے بچوں سے

چلو.....شروع کرو اَلف خالی.....بے کے نیچے ایک نقطہ۔

بچے کورس میں پوری طاقت لگا کر دوھراتے ھیں

بچے : اَلِف خالی.....بے کے نیچے ایک نکتہ۔

چھوٹی نانی: پے کے نیچے تین نقطے.....'ح' خالی.....'ج' کے پیٹ میں ایک نقطہ۔

بچے اسے کورس میں دوہراتے ہیں۔

چھوٹی نانی: ایک لمحہ رک کر سلیم سے

کیوں رے سلیم، تو نے لکھن رِلاوٹ کا گھر دیکھا ہے؟

سلیم : جھپٹ کر.....

ہاں، دیکھا ہے نانی

چھوٹی نانی: دُلار سے

جا ذرا.....اس کی بیوی سے پوچھنا کہ وہ نکھٹو آخر ہے کہاں؟

پھر اپنے۔۔آپ سے

میری پھوٹی قسمت بھی ایسی ہے کہ جہاں ہاتھ ڈالو، وہیں بچھو نکل پڑتا ہے۔ لکھن کو پِتائی کے لئے بلایا.....متی میری ہی ماری گئی تھی کہ شکر لانے کو اُسے سو کا نوٹ تھما دیا.....تب کا گیا..... اب آئے تب آئے.....چار دن گزر گئے.....خیر، جائے گا کہاں؟ آج نہیں تو کل منہ بسورتا یہیں آئے گا.....

پھر سلیم سے

یہ سب اُس کی بیوی سے مت کہنا، لاج کے مارے مرجائے گی بیچاری۔
بس اتنا کہنا کہ لکھن آئے تو اسے فوراً چھوٹی نانی کے پاس بھیج دیں.....

سلیم سپارہ بند کر جانے لگتا ھے۔

چھوٹی نانی: سلیم سے

اور سن..... لکھن کی طرح تو بھی غائب مت ہو جانا، ورنہ میں تیرے ماں باپ کو کیا جواب دیتی پھروں گی۔

بچے ھنس پڑتے ھیں

چھوٹی نانی کھڑی ھو کر اپنے کپڑے جھاڑتی ھیں

اور سُوئی ڈورا سمیٹتی ھیں

چھوٹی نانی: صغرا سے

اور ہاں..... صغرا..... یہ جو میتھی کے ڈنٹھل میں نے توڑ کر رکھے ہیں..... ذرا تو بیٹا، انہیں سراج کی بکری کو ڈال آ۔

صغرا سپارہ بند کر کے جانے کو اٹھ کھڑی ھوتی ھے۔

چھوٹی نانی: خود سے.....

جس گھر میں انسانوں کے کھانے کے لالے پڑ رہے ہوں وہاں بے زبان کی کیا پوچھ۔

صغرا سے

سنا ہے اس کے بیٹے تاج کے بڑے پر نکل آئے ہیں.....گھر کی ہر چیز گروی رکھ ڈالتا ہے۔تو.....بیٹا اپنی تھالی وہاں مت چھوڑنا.....ورنہ میں کس ساہوکار سے چھڑاتی پھروں گی۔

صغرا ڈنٹھلوں سے بھری تھالی اٹھا کر چل پڑتی ہیے۔ چھوٹی نانی ھاتھ کے کپڑے کوتح کرتی ھیں۔ کچھ سوچ کر ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ھیں۔

چھوٹی نانی: جمیلا سے

جمیلا.....ذرا اُٹھ تو بیٹا

تیسری لڑکی جمیلا سپارہ بند کر کے اٹھتی ھے۔

چھوٹی نانی: جمیلا کو کپڑا تھماتے ہوئے۔

لو یہ اپنی شہزادی آپا کو دے دینا او پوچھنا کہ چھٹکی کا بخار اُترا کہ نہیں۔

خود سے طنز اور غصے کے انداز میں

یہ سب تو نوابوں کی اولادیں ہیں۔ان کی ہر خبر ہمیں رکھنی ہے۔خود سے بتا دیں تو اُن کی ناک نہ کٹ جائے۔

جمیلا سے

جا.....دونوں وقت مل رہے ہیں.....ذرا جلدی آجانا

آف د اسکرین ازان کی آواز۔

جمیلا کپڑا لے کر چل دیتی ہے۔ اذان کی آواز سن کر چھوٹی نانی جلدی سے سر پر دوپٹا ڈالتی ہیں۔ پھر وہ جانماز بچھا کر نماز پڑھنے کی تیاری کرتی ہیں۔ تبھی سلیم کی آمد۔

سلیم: چھوٹی نانی

میں نے بھابھی سے کہہ دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے جیسے ہی لکھن بھیا آئیں گے.....انہیں آپ کے پاس بھیج دیں گی۔

چھوٹی نانی:

اچھا بیٹا.....جیتے رہو.....اب گھر جاؤں.....اور دیکھو آج کی طرح کل بھی دیر سے مت آنا۔

سلیم اپنا سپارہ اور رحل بغل میں دباتا ہے اور چلنے لگتا ہے۔ تبھی ستّر سال کا ایک بزرگ شخص وھیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اندر آتا ہے۔ اُس کی داڑھی، سِر کے بال، یہاں تک کہ بھونہے تک سفید ہیں۔ یہ میاں یعنی چھوٹی نانی کے بھائی

ھیں۔ میاں کو سامنے پا کر سلیم سلام کرتاھے۔

سلیم: میاں..... سلام۔

میاں: کھوئی کھوئی نگاہوں سے سلیم کو دیکھتے ہوئے.....
کہاں رہتے ہو بیٹے؟

سلیم: مزے لے کر
قاضی صاحب کے باڑے میں۔

میاں: اُسی انداز میں
کیا نام ہے؟

سلیم: سلیم الدین۔
میاں: والد کا نام
سلیم: علیم الدین صاحب
میاں: بیٹے ہندو ہو یا مسلمان؟

سلیم مسکرا کر چھوٹی نانی کی طرف دیکھتا ھے۔

چھوٹی نانی جھپٹ کر میاں کے پاس پہنچتی ھیں۔

چھوٹی نانی: بھائی جان..... چلئے نماز کا وقت ہو رہا ہے۔

چھوٹی نانی وھیل چیئر کو دھکیل کر اندر لے جاتی ھیں۔

سین نمبر ۲

رات / حویلی کا آنگن / چھوٹی نانی اور مشتاق کے سامنے دستر خوان بچھا ھے، جس پر پلیٹیں اور کھانے کے برتن سجے ھیں۔ یہ دونوں کھانا کھا رھے ھیں۔

مشتاق: پلیٹ میں سے سبزی نکالتے ہوئے۔

چھوٹی نانی، یہاں مرزا واڑی کا اتنا بڑا دروازہ کس نے بنوایا ہوگا؟۔

چھوٹی نانی: مسکرا کر

تمہارے پرنانا نے.....اور کس نے..... مرزا چمن بیگ..... یہ پوری بستی

انہیں کی بسائی ہوئی ہے۔

مشتاق: تعجب سے....

اتنا بڑا دروازہ کیوں؟

چھوٹی نانی: سمجھانے کے انداز میں....

تب موٹر کار تو تھی نہیں، لوگ اونٹوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی سواری کرتے تھے۔

مشتاق: اور بھی زیادہ تعجب سے

نانا بھی ہاتھی کی سواری کرتے تھے؟

چھوٹی نانی: اس گھر میں گھوڑے اور بیل گاڑیاں تو میں نے دیکھیں، لیکن ہاتھی نہیں دیکھا۔ سنتے ہیں کہ پہلے ہاتھی بھی ہوا کرتے تھے۔ تمہارے نانا کے پاس تو عرب نسل کی لمبی چوڑی گھوڑی تھی..... اس کی بات ہی الگ تھی..... دور سے ہی اس کی ٹاپ پہچان میں آجاتی تھی۔

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خیالوں میں کھوتے ہوئے۔

وہ زما

نہ ہی الگ تھا بیٹے..... دمنیاں کستی تھیں۔ پورا قافلہ اپنے گاؤں پان بڑودہ کی طرف..... چل پڑتا تھا۔ تمہارے نانا اپنی عربی گھوڑی پر سوار

کندھے پر بندوق ڈالے، امرائیوں پر جھولے پڑتے پان پورے روب سے آگے آگے چلے تھے، پورے گاؤں میں پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔ چاروں طرف مٹی کا سوندھاپن اور پکوانوں کی مہک پھیل جاتی۔ جب تک ہم لوگ وہاں رہتے، گاؤں کا ماحول میلے میں بدل جاتا۔

پل دو پل رک کر

اناج گھر کا، دالیں گھر کی، پھل، سبزیاں سب اپنے کھیتوں کی۔

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر

اب وہ سب کہاں!

مشتاق: دونوں ہاتھ اٹھا کر

پیٹ بھر گیا..... اللہ شکر

چھوٹی نانی: مشتاق سے

جاؤ پہلے اٹھوں اور ہاتھ دھولو.....

مشتاق: (اٹھتے ہوئے)

میں کہہ رہا تھا، وہ اب تک نہیں آئیں؟

چھوٹی نانی: (حیران ہوکر)

کون؟

(تھوڑا رک کر طنز اور چڑچڑاہٹ کے ساتھ)

سکینہ! وہ ٹھہری بے فکر بڑھیا۔ نہ کوئی آگے، نہ کوئی پیچھے۔ صبح سے تفریح کے لئے نکلی ہیں تو دیکھ لو.....اب تک ندارد۔

(تبھی آنگن کی آنکل گھومتی ہے اور دروازہ اندر کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ اگلے ہی پل ایک لاٹھی دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ جسے جھرّیوں سے بھرے ہاتھ نے تھام رکھا ہے اور لاٹھی کے نچلے سرے پر زمین سے ٹکرا ٹکرا کر داڑھی سی نکل آئی ہے۔ اگلے ہی پل سکینہ یعنی بڑی نانی داخل ہوتی ہیں۔ سکینہ کی عمر ۶۰۔۶۵ کے بیچ، کمر جھکی ہوئی۔ چہرے پر جھرّیاں وہ لاٹھی ٹیک ٹیک کر آگے بڑھتی ہیں۔ مشتاق اٹھ بیٹھتا ہے۔)

مشتاق (چہک کر)

لو، بڑی نانی آگئیں.....

چھوٹی نانی: (آہستہ سے، خود سے)

شیطان کو یاد کرو اور شیطان حاضر۔

(سکینہ سامان سے لدی ہوئی ہیں۔ وہ آنگن میں رک کر ہانپتی ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھتی ہیں۔ مشتاق دوڑ کر ان کے پاس پہنچتا ہے۔)

مشتاق: لاؤ مجھے دے دو بڑی نانی۔

بڑی نانی کے کندھے پر ٹنگا جھولا مشتاق لےلیتاھے۔

سکینہ قریب ہی بچھے تخیت پر بیٹھ جاتی ہیں
اور جھولے میں سے خربوز نکال کر شتاق کر
تھماتی ہیں۔ پھر یك لٹو نکالتی ہیں۔

سکینہ: مشتاق سے
لے..... تجھے لٹو چاہئے تھا نہ.....

مشتاق خوشی خشی لٹو لے لیتاھے۔ پھر اُس میں
ڈورا لپیٹنے کی کوشش کرتاھے..... ناکام ہو کر
لٹو بڑی نانی کی طرف بڑھاتا ھے۔

مشتاق: بڑی نانی.....ذرا آپ گھما کر بتاؤ لٹو۔

سکینہ ھنستے ھوئے اپنا سامان سمیٹتی ھیں۔ لاٹھی
سنبھالتی ھیں اور اٹھ جاتی ھیں۔ اسی بیچ چھوٹی
نانی چولھا چوکا سمیٹنے لگتی ھیں۔

سکینہ: ہنسی اور لاچاری سے۔
بیٹے میری عمر لٹو گھمانے کی ہے کیا؟

بھوپال کے بھارت بھون میں، افتخار اکادمی کے بینر پر کھیلے گئے
ڈرامہ ''چھوٹی ڈیوڑھی والیاں'' کی چند تصاویر

چھوٹی نانی (پشپ نیر) بچوں کو پڑھاتے ہوئے۔ ساتھ میں بیٹھی ہے صغرا (انترا راٹھی)
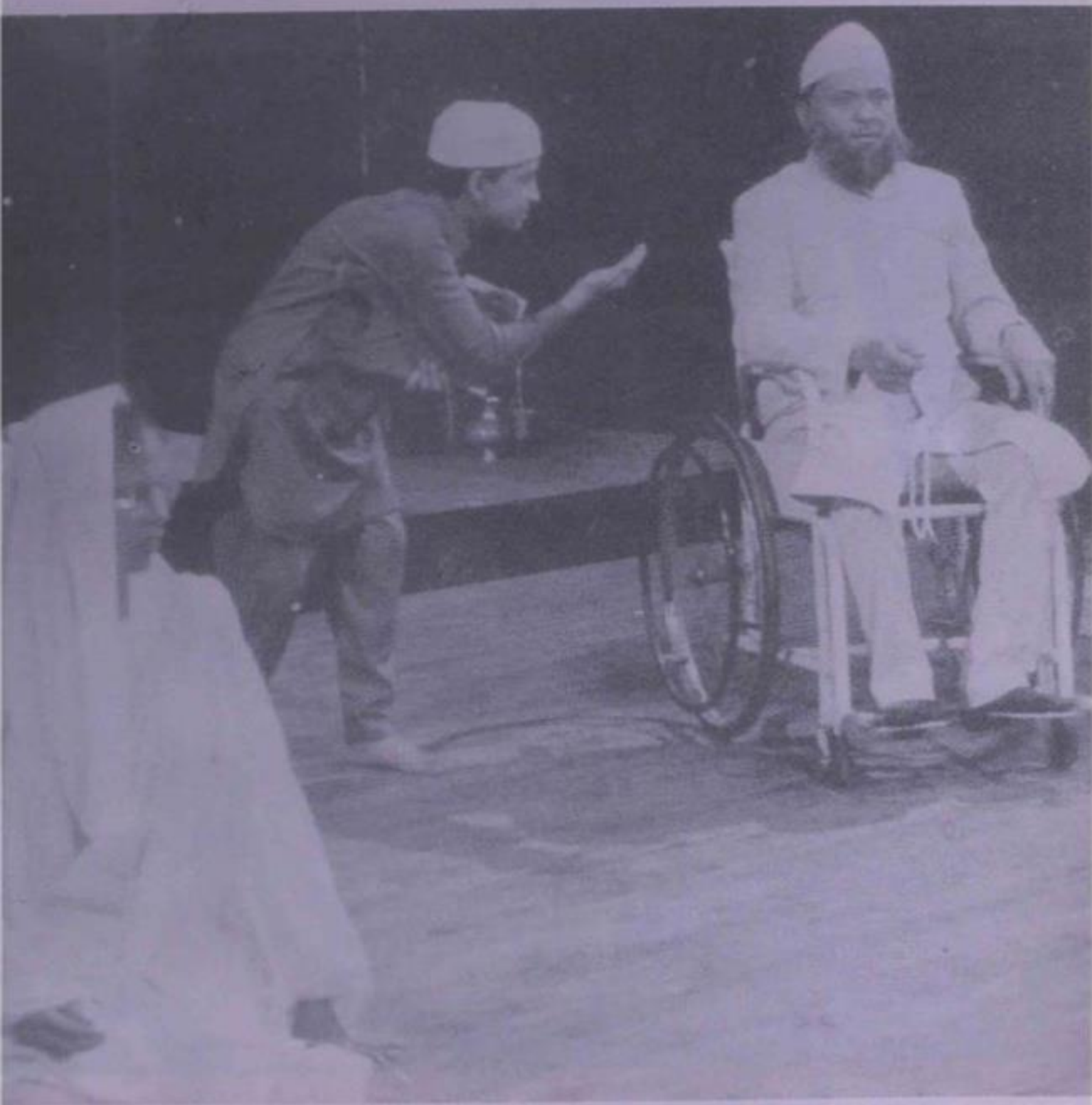
چھوٹی نانی (پشپ نیر) ساتھ میں میاں (مقصود رضا خاں) کو سلام کرتے ہوئے
سلیم (پرئے چگ)

چھوٹی نانی (پشپ نیر) اور مشتاق (احد بجاج)

رشتوں کی دھوپ چھاؤں: چھوٹی نانی (پشپ نیر) اور بڑی نانی (سویتا بھارگو)
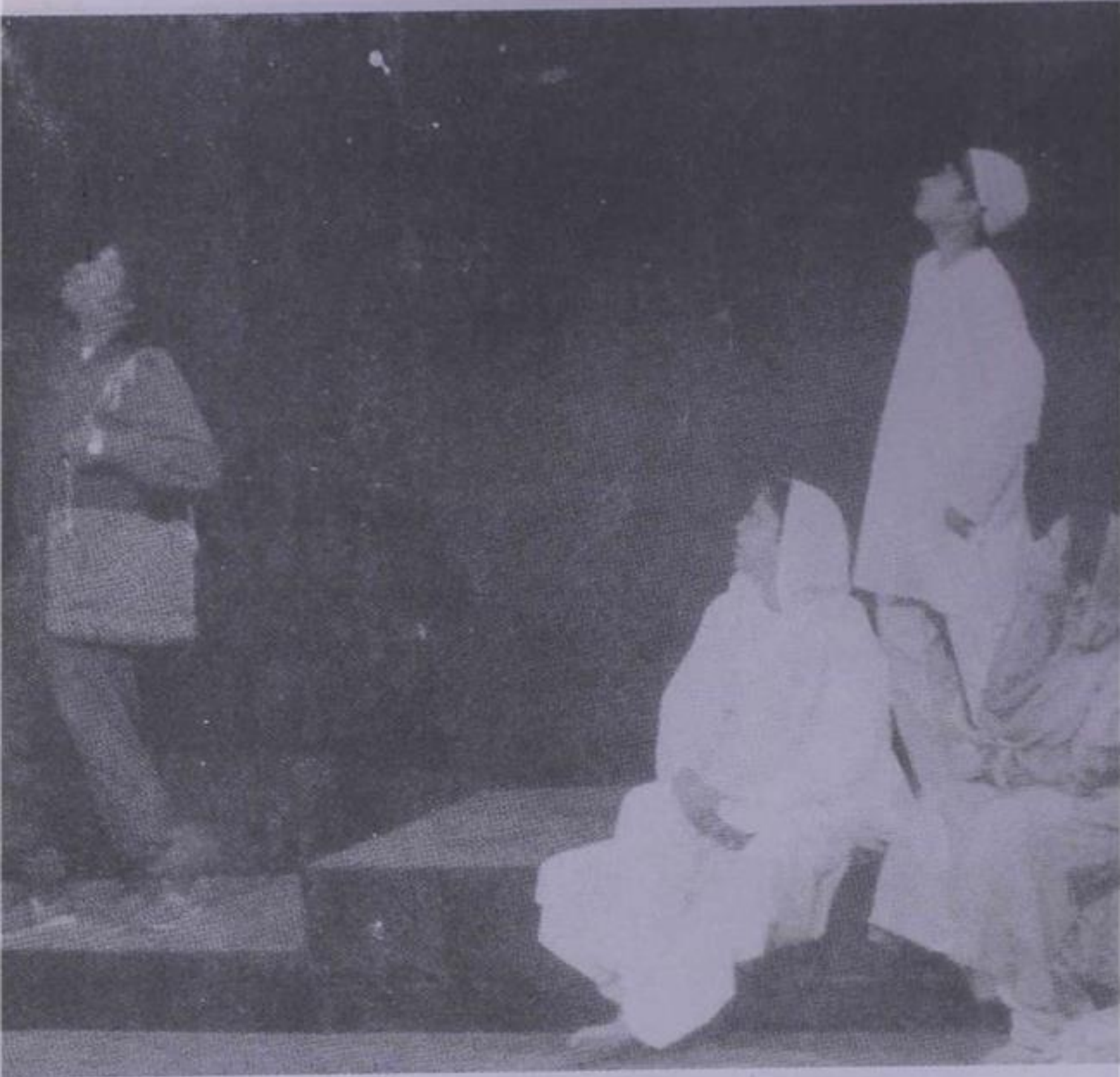
کالے خاں (جاوید زیدی) کی باتوں کا لطف لیتی ہوئی چھوٹی
نانی، مشتاق، شہزادی (پرینکا) اور ممتاز بائی (پریا بوس)

عید کا موقعہ: ظہیر (گنپت ایس پاٹھک)، عباس (حمید اللہ خاں ماموں)، آشارام (کے. جی
ترویدی)، نند کشور (سلمان)، میاں (مقصود رضا خاں) اور کالے خاں

جذباتی لمحے، چھوٹی نانی (پشپ نیر)، مشتاق (احد بجاج) اور شہزادی (پرینکا)
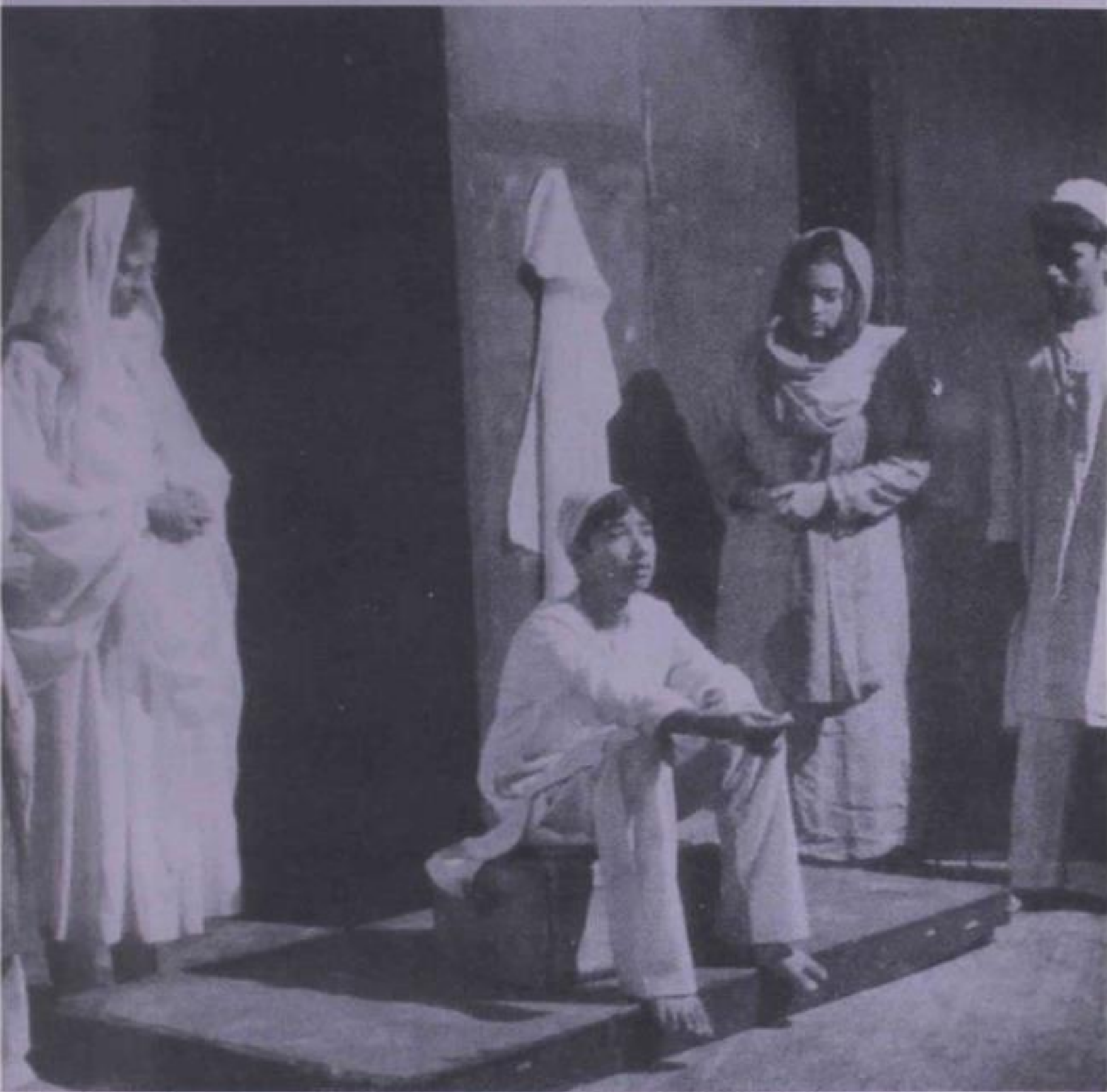
کہانی پرسے پرت در پرت پردہ اُٹھاتا مشتاق اور حیرانگی سے اُسے سنتی ہوئی ممتاز، چھوٹی
نانی، شہزادی اور ظہیر

سکینہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی ہیں۔

مُشتاق: شرارت سے
چھوٹی نانی، بڑی نانی کو تو لٹو گھمانا بھی نہیں آتا۔

چھوٹی نانی: دانت پیستے ہوئے
ارے جو خود صبح سے شام تک ساری دنیا میں لٹو کی طرح گھومتی رہے، وہ لٹو کیا گھمائے گی۔

سین نمبر ۳

باورچی خانے میں

صبح کا وقت ہے۔ کونے میں بنے باورچی خانے میں چھوٹی نانی کھانا بنا رہی ہیں۔ مشتاق ان کے سامنے بیٹھا ہے۔

مشتاق: چولہے میں پھونکنی سے پھونکتا ہے، پھر بولتا ہے۔
چھوٹی نانی..... بڑی نانی میری تو نانی ہیں..... آپ کی کیا لگتی ہیں؟

چھوٹی نانی: پریشان ہوکر۔ لے اٹھ ذرا اس پتیلی میں پانی لے کر آ۔
پھر خود سے۔
مانو تو سب کچھ، نہ مانو تو کچھ نہیں۔

مشتاق: لوٹ کر آتا ہے۔
بتاؤنا نانی؟
چھوٹی نانی جلدی جلدی ایک کٹورے میں سبزی نکالتی ھیں، اس پر پلیٹ ڈھکتی ھیں اور مشتاق کو تھماتی ھیں۔

چھوٹی نانی: یہ لے، اپنی بڑی نانی کو دے آ..... اور دیکھ، کٹورا پلیٹ وہاں چھوڑ کر مت آنا۔۔۔
مشتاق سبزی کا کٹورا لے کر چلا جاتا ھے۔ چھوٹی نانی کے چھرہ پر طرح طرح کے تاثرات آجارھے ھیں۔ جیسے وہ من ھی من باتیں کر رھی ھوں۔ وہ بڑبڑا رھی ھیں اور ساتھ ھی لکڑیوں کے جلے ھوئے سرد راکھ میں گھساتی جارھی ھیں۔

چھوٹی نانی: خیالوں میں کھو کر، تکلیف کے ساتھ ہوا میں دیکھتے ہوئے۔
سکینہ میری کیا لگتی ہیں؟ کس کس کو کلیجہ چیر کر دکھاؤں..... مرزا جی کو بھی کیا سوجھی، اس کلو پری کو سر پر بٹھا رکھا تھا اور مجھے بیاہ کر لے آئے..... چودہ سال کی عمر..... میں تو کچھ جانتی، سمجھتی تک نہیں تھی، لیکن جو آ کر دیکھا، اِس گھر میں سکینہ کے اشارے کے بغیر کسی کے پیٹ کا پانی تک نہیں ہل سکتا تھا..... ہر جگہ تالے میرے نام کے اور چابیاں سکینہ کے پاس.....

تبھی مشتاق خالی کٹورا اور پلیٹ لے کر لوٹتا ھے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ھے۔

مشتاق: چھوٹی نانی کو لکڑیاں بجھاتے دیکھ۔۔
نانی..... بڑی نانی اور امّی تو لکڑیوں پر پانی ڈال کر بجھاتی ہیں؟

چھوٹی نانی: کھوئے انداز میں خود سے
آگ..... آگ بجھاتی کہاں ہے بیٹے۔
بظاهر مشتاق سے ویسے خود سے
آگ پر پانی ڈالو تو دھواں اٹھتا ہے، جو اپنی ہی آنکھوں کو جلاتا ہے..... راکھ میں آگ بجھتی نہیں ہے..... ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اس ٹھنڈی آگ کی بچی کھچی چنگاریوں سے جب چاہیں ایک نئی آگ پیدا کر سکتے ہیں۔

سین نمبر ۴

آنگن میں

مشتاق، پتنگ کو سکینہ کی لاٹھی کے داڑھی والے سِرے سے اُچک اُچک کر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پردے کے پیچھے سے سکینہ کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

سکینہ: مشتاق، ارے او مشتاق..... لاٹھی لے آ بھیا..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔

مشتاق: پتنگ نکالنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے۔
بس..... ابھی آیا.....

تبھی سکینہ کی آمد ہوتی ہے۔ مشتاق کو اور پتنگ کو پل دو پل دیکھتی ہیں۔

سکینہ: مشتاق کی طرف بڑھتے ہوئے۔
اب چھوڑ اِسے، میں تجھے دوسری پتنگ دِلا دوں گی۔

مشتاق کا ھاتھ اچانک رک جاتا ھے اور وہ لاٹھی
سکینہ کو تھماتا ھے۔

مشتاق: خوشی سے جھوم کر۔
اور مانجا بھی۔

سکینہ: سکینہ لاٹھی لیتی ہے پھر مشتاق کو نہارتے ہوئے۔
ہاں ہاں مانجا بھی۔
اسی بیچ چھوٹی نانی رضائی اٹھائے ھوئے آنگن
میں آتی ھیں۔

چھوٹی نانی: لے بھیا مشتاق، ذرا رضائی پکڑ والے

مشتاق رضائی پکڑتا ھے۔پھر دونوں مل کر اسے
فرش پر پھیلا دیتے ھیں۔ سکینہ لاٹھی ٹیکتی ھوئی
باھر نکل جاتی ھے۔ چھوٹی نانی رضائی میں
ڈورے ڈالنے لگتی ھیں۔تبھی بیک گراؤنڈ سے گیت
کی دھُن اُبھرتی ھے۔

مشتاق: خوشی کے بھاؤ سے

چھوٹی نانی، وکیل چچا کے گھر کے آنگن کے سامنے بڑا سا شامیانہ لگ گیا ہے..... شام کو بارات آنی ہے..... ہم نہیں چلیں گے شادی میں.....؟

چھوٹی نانی: چلنا تو ہے بیٹا!

ایک بار مشتاق کی طرف دیکھتی ہیں، پھر تیزی سے ہاتھ چلاتی ہوئیں

اس رضائی سے تو پیچھا چھوٹے۔ یہ پوری ہو گی، تبھی میری جان کو سکون ملے گا..... دیکھو موسم بھی کتنی تیزی سے بدل رہا ہے۔

مشتاق: ٹھیک سامنے بیٹھ کر

چھوٹی نانی، کیا آپ کی شادی میں باجے والے آئے تھے؟

چھوٹی نانی: ہاں۔

چہرے پر چمک اور ہلکی مسکراہٹ ابھرتی ہے۔ پل بھر کے لئے وہ کھیں کھو جاتی ہیں ہاتھ تھم جاتاھے۔

اس طرح کے بینڈ والے تو تب نہیں تھے۔ لیکن دس بارہ دن پہلے ہی مراثی اور مراسنیں آ دھمکتی تھیں۔ رات رات بھر قوالیاں چلتیں..... میلاد

ہوتے.....تمہارے نانا کی بارات میں پورا شہر اُمڈ پڑا تھا..... پوری رات مُجرا چلتا رہا..... مجھے اب تک یاد ہے..... جب میری ڈولی اٹھی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

مشتاق: اور امّی کی شادی میں.....

چھوٹی نانی: ایک لمحہ مشتاق کی طرف دیکھتی ہیں، پھر رضائی میں ڈورا ڈالتے ہوئے اور ٹھنڈی آہ بھر کر۔

شادی میں تو نہیں..... لیکن ہاں، جب اِس کی بسم اللہ ہوئی تھی نہ، تب آیا تھا..... کیا نام ہے اُس کا..... وہی کمال بینڈ۔

مشتاق: بسم اللہ.....

قہقہہ لگا کر

یہ کیا ہوتا ہے نانی؟

چھوٹی نانی: ارے تمہاری امّی شہزادی نے جب پڑھنا شروع کیا.....

مشتاق: بات کاٹ کر

پر امّی کو تو پڑھنا آتا ہی نہیں ہے۔

چھوٹی نانی: جھلا کر

پتہ ہے مجھے.....

پھر سنبھل کر

لیکن اِس نے جب 'اِلف'.....'بے' پڑھنا شروع کیا تھا تب

چھلک کر

شہر قاضی آئے تھے اسے پہلا سبق پڑھانے.....تمہارے نانا نے پوری بستی کو اکٹھا کر لیا تھا.....

غم زدہ ہو کر

لیکن شہزادی کی تو قسمت ہی پھوٹی ہے.....اس میں کوئی کیا کرے..... اس کے ہوش سنبھالتے سنبھالتے سب کچھ چوپٹ ہو گیا.....بینڈ باجے تو دور کی بات.....پھوٹا ڈھول تک نصیب نہیں ہوا بیچاری کو.....

تبھی ۳۰۔۳۲ سال کی ایک خاتون داخل ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی نانی کی بیٹی شہزادی ہے اس نے کالا بُرقعہ پہناہوا ہے۔ اسٹیج پر آتے ہی وہ نقاب اتارتی ہیں اور مشتاق دوڑ کر امی امی کہتے ہوئے شہزادی سے چپک جاتا ہے۔

شہزادی: چھوٹی نانی کے قریب آ کر

اماں، سلام

چھوٹی نانی: اس کی بلائیں لیتی ہے۔ پیشانی چومتی ہے۔

جیتی رہو..... اللہ خوش رکھے..... چھٹکی کو نہیں لائیں؟

شہزادی: لاچاری سے

کیسے لاتی..... کل رات بھی تپتی رہی۔ ابھی اس کا بخار گیا کہاں ہے۔

چھوٹی نانی: کچھ دوا وَوا بھی کی ہے کہ نہیں..... یا اللہ بھروسے چھوڑ رکھا ہے اُسے۔

شہزادی: پہلے تو درگاہ والے وید جی کی خوراک چلتی رہی..... پھر مشتاق کے پاپا..... آشارام جی سے کچھ پیسے ویسے لائیں تب کہیں چھٹکی کو ڈاکٹر پنڈت کے پاس لے گئے۔

چھوٹی نانی: ناراضگی سے

کیوں بیاز۔ تِدراز کے چکر میں پڑتے ہو تم لوگ.....

لاچاری سے

اب یہاں تو حال یہ ہے کہ ایک ٹانگ کو ڈھکو تو، دوسری کو لاج آئے.....

دوسری کو ڈھنکو تو پہلی شرما جائے۔

رازداری کے انداز سے

سکینہ سے کہہ دیا ہوتا.....

شہزادی: ہاں اماں، سوچا تھا پر انہوں نے روک دیا۔ بولے، کسی بڑی ضرورت پر ہاتھ پھیلانا پڑے تو بات الگ ہے۔

چھوٹی نانی: دانت پیس کر

یہ ظہیر بھی اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔

شہزادی: سہمتے ہوئے

کہہ رہے تھے، مشتاق کو بھی ساتھ لیتی آنا، بہت دن ہو گئے اب۔

چھوٹی نانی: پل دو پل شہزادی کا چہرہ تکتی ہیں۔ پھر ان کا چہرہ غصّے سے تمتما جاتا ہے۔

کتنے خودغرض ہو تم لوگ..... اپنے بیٹے کو لے جانا چاہتی ہو..... لے جاؤ۔

تبھی ممتاز داخل ہوتی ہے۔ عمر ۳۰-۳۵ سال-لباس نوکرانیوں کا لیکن پان چبائے ہوئے ہے۔

ممتاز: با آواز بلند

نانی سلام.....

پھر شہزادی سے

آپا.....آج عید کا چند کدھر سے نکل آیا۔

شہزادی: پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ

کیسی ہو ممتاز بائی؟۔

ممتاز: قہقہہ لگا کر

ارے اپنی کیا پوچھو، اپنی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر ہمیشہ کڑھائی میں.....

چھوٹی نانی کو خیالوں میں کھوئی اور غصّے میں دیکھ اُن کے ھاتھ سے رضائی لیتے ہوئے۔

لاؤ نانی، مجھے دے دو

ممتاز جلدی جلدی رضائی میں ٹانکے مارنے لگتی ھے۔

شہزادی : ہنس کر

اماں، تم تو خوامخواہ غصہ ہو گئیں..... میں نے تو جیسا انہوں نے کہا تھا.....
بتا دیا..... مشتاق کو لے تو نہیں گئی۔

چھوٹی نانی: بھرّائی ہوئی آواز میں
بزرگوں نے کہا ہے، پہلے تولو، پھر بولو، تم نے سوچا نہیں..... میں اکیلی
بڑھیا اس ڈیوڑھی میں بھٹکن روح کی طرح بھٹکوں گی تو کیاں تمہیں اچھا
لگے گا؟

ممتاز: ہنس کر
ارے نانی تم اکیلی کہاں ہو..... میں جو ہوں تمہارے پاس..... جب چاہو
بلا لو..... ارے ہاں..... وہ کہاں چلے گئے آپ کے سپہ سالار.....

چھوٹی نانی: حیران ہو کر
کون؟

پھر یاد آتے ہی ہنس کر
کالے خاں..... ارے، اسے زندوں کی خبر لینے بھیجو..... تو مردوں کی خبر
لاتا ہے.....

تبھی مشتاق دوڑتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

مشتاق: نانی..... کالے خاں آ گئے۔

۵۰-۵۵ سال کا ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ جس نے گھِسا پِٹا سا فوجی لباس پہنا ہوا ہے۔ سِر پر کیپ اور آنکھوں پر کالا چشما بھی ہے۔ اس کی قمیض پر طرح طرح کے بلّے لگے ہیں، کالے خاں کو دیکھ کر سب لوگ ہنس پڑتے ہیں۔

چھوٹی نانی: نقلی غصہ دکھاتے ہوئے

کہاں غائب رہے اتنے دِن؟

کالے خاں: لاپرواہی کے انداز میں

دیواس چلا گیا تھا.... ڈول گیارس دیکھنے.....

ممتاز: قہقہہ لگاتے ہوئے

اَو! ڈول گیارس کا جلوس دیکھنے چلے گئے دیواس! ارے بھیّا، ڈول گیارس کا جلوس تو اپنے اجّین میں بھی نکلا تھا.....

کالے خاں: اَن سنی کرتے ہوئے پورے جوش سے---

اس بار تو بڑی پانتی والے مہاراج نے ایسا جلوس نکالا کی باپ رے باپ..... بینڈ۔باجے..... گھوڑسوار۔ دوسرے دن چھوٹی پانتی والے مہاراج نے ہاتھیوں کا جلوس نکلوایا۔..... بس مزہ آگیا۔

مشتاق: ہنس کر

دو دن تو یہ ہو گئے۔ باقی دن کہاں رہے؟

کالے خاں: دوگنے جوش کے ساتھ

پھر بڑی پانتی والوں نے محرم پر ۳۱ فٹ اونچا تازیہ بنوایا۔

شہزادی: مزے لیتے ہوئے

یعنی تمہاری چھوٹی پانتی والوں کی ناک کٹ گئی اس بار.....

کالے خاں: تمک کر

ارے، چھوٹی پانتی والے کہاں چوکنے والے تھے.....انہوں نے اِکاون فٹ کا تازیہ بنوایا۔ لوگوں نے تازیے کو کاندھے پر اُٹھایا تو وہ بڑی ٹیکری سے بھی اوپر نکل گیا۔

سب لوگ قہقہہ لگاکر ہنس پڑتے ہیں۔

مشتاق: ہنستے ہوئے

ٹیکری سے بھی اونچا تازیہ۔

چھوٹی نانی: ہلکے سے سر پیٹتے ہوئے

اب دیکھو نہ، اتنے بڑے بڑے راجے مہاراجے اور حرکتیں بچوں جیسی.....

کالے خاں کو ڈپٹ کر

چلو تفریحیں ہوگئی..... سارے مٹکے خالی پڑے ہیں..... میرے گھٹنے جواب دے گئے بالٹیاں اٹھا اٹھا کر.....

پھر آنگن کے کونے سے کالے خاں کھِسیائے ہوئے انداز میں ایک نگاہ سب پر ڈالتا ہیں اور دو بالٹیاں اٹھا کر باہر کی طرف چل پڑتے ہیں۔

مشتاق: نانی..... کیا کالے خاں پہلے فوج میں تھے؟

چھوٹی نانی: ہنس کر

عقل سے پیدل، دماغ سے بوجھل..... ڈرپوک..... بزدل..... کام چور..... اس کا فوج سے کیا لینا دینا۔

پھر اچانک سنجیدہ ہو کر

ہاں اس کے باپ دادا کبھی دیواس مہاراج کے لشکر میں رہے ہوں گے..... یہ بیچارا آج بھی انہیں کی دنیا میں جی رہا ہے۔

ممتاز: چٹکی لیتے ہوئے

اوپر والا نانی کے لئے بھی..... چھانٹ چھانٹ کے ایسے نگ بھیجتا ہے کہ.....

سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے ہیں۔

چھوٹی نانی: پہلے تو ہنستی ہیں..... پھر ٹھنڈی آہ بھرتی ہیں..... پھر سنجیدہ ہو کر

ان چِڑیا چلے بیچاروں کا کیا ہے۔ جہاں سایہ دِکھا وہیں بیٹھ گئے۔

تبھی کالے خاں کا پانی سے لبالب بھری بالٹیوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔

چھوٹی نانی: ایک نظر کالے خاں پر ڈالتے ہوئے

اسی بہانے خیرات..... زکوٰۃ..... امداد بھی ہو جاتی ہے..... لیکن ہاں..... یہ سچ ہے کہ ان کا گھر میں ہونا سہارا بھی ہے اور سر درد بھی.....

تبھی کالے خاں بالٹیوں کا پانی مٹکے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالٹی مٹکے سے ٹکراتی ہے۔ مٹکا ٹوٹ جاتا ہے اور چاروں طرف پانی پھیل جاتا ہے۔

چھوٹی نانی: سر پیٹ کر

ارے غضب.....ستیاناس ہو اِس کا.....میرا نیا کا نیا مٹکا توڑ ڈالا.....

فرش پر پانی پھیل جاتاھے۔ شھزادی اور ممتاز رضائی کو اٹھاکر دوڑتی ھیں۔ ایك بھگدڑ سی مچ جاتی ھے۔

سین نمبر ۵

سکینہ کا کمرہ

(سکینہ چٹائی پر بیٹھی ھیں اور ان کے سامنے ٹِن کی صندوق رکھی ھے۔ وہ صندوق کو جما رھی ھیں۔ کچا چولھا بنا ھے۔ قریب ھی المونیم کے نقّاشی دار کٹورے سے ڈھکا مٹکا رکھاھے۔ ایك کون میں لاٹھی دیوار سے ٹیکی کھڑی ھے۔ ایك چارپائی پر بستر بچھاھے۔ چولھے کے اوپر لکڑی کے اسٹینڈ پر کچھ برتن سجے ھیں۔ تبھی مشتاق کمرے میں داخل ھوتاھے۔)

مشتاق: ضِد کرنے والے انداز میں۔
بڑی نانی، چلو نا.....

سکینہ جلدی سے صندوق بند کرتی ہیں اور اُس میں تالا ڈالتی ہیں۔

سکینہ: پیار سے
تو اندر تو آ.....

سکینہ پلّو سے چابی باندھتی ہیں۔ مشتاق اندر آتاھے

سکینہ: اُٹھتے ہوئے
لے ذرا صندوق پکڑ.....

مشتاق اور سکینہ صندوق کو اٹھاکر ایک طرف رکھتے ہیں

مشتاق: آپ کہہ رہی تھی نا، بازار چلنا ہے۔

سکینہ: وہ تو میں نے کل کے لئے کہا تھا..... لیکن کل تو تم شادی میں چلے گئے۔

مشتاق: ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے

تو..... چلو..... ابھی چلو نا.....

سکینہ: سمجھاتے ہوئے

تم کیسی باتیں کر رہے ہو..... آج تو دیر ہو گئی اور کل جمعہ ہے..... اب سنیچر کو چلیں گے۔

مشتاق: لگ بھگ پاؤں پٹکتے ہوئے۔

بڑی نانی! چلو بھی..... جمعے کو آپ کو کون سی نماز پڑھنی ہوتی ہے۔

سکینہ: پہلے مسکراتی ہیں..... پھر سمجھاتی ہیں۔

اب نماز پڑھوں..... نا پڑھوں..... مولانا صاحب کی درگاہ تو جاتی ہوں..... فاتحہ تو پڑھتی ہوں..... دعا تو مانگتی ہوں..... اچھا، ذرا مجھے پانی تو پلا دو۔

مشتاق مٹکے کے پاس جاتاہے۔ کٹورہ اٹھا کر!

اُسے غور سے دیکھتا ھے۔

مشتاق: بڑی نانا.....کٹورے پر کیا قلائی کروالی؟

سکینہ: ارے نہیں رے.....ذرا راکھ سے رگڑ لیا.....دیکھ.....کیسا چمکنے لگا۔

مشتاق ڈونگے سے کٹورے میں پانی بھر کر سکینہ کو دیتاھے۔ سکینہ ایک ھاتھ سِر پر رکھ کر پانی پیتی ھیں۔ اسی بیچ مشتاق اپنی لاٹھی اٹھا لیتا ھے اور لاٹھی ٹیک کر خود اپنی کمر جھکا کر سکینہ والے انداز میں دروازے کی طرف بڑھتاھے۔

مشتاق: شرارت سے

بڑی نانی، میں تو چلا..... اب دیکھتا ہوں آپ کیسے جاتی ہیں۔ مولانا صاحب.....

مشتاق باھر نکلتاھے۔

سین نمبر ٦

دِن / باہر / آنگن

چھوٹی نانی سیوئیوں کے لئے میدا گوندھ رھی

ھیس۔ صغرا چھلنی سے آٹا چھان رھی ھے۔ جمیلا بھی مصروف ھے۔

چھوٹی نانی: لو.....عید سر پر آگئی اور یہاں ابھی سیوئیوں کا نام ونشان تک نہیں ہے.....اری کوئی جاؤ اور اُس ممتاز کی بچی کو پکڑ کر لاؤ.....تبھی کام آنن فانن میں ہوگا.....ورنہ ہمیں تو ہفتوں لگ جائیں گے۔

جمیلا: پاس والی لڑکی سے۔
جا صغرا.....تو ہی چلی جا.....

صغرا: صاف منہ کرتے ہوئے
نہیں.....مجھے بڑی ڈیوڑھی میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

چھوٹی نانی: سمجھاتے ہوئے لیکن چہرے میں طنز بھر کر
اب بڑی ڈیوڑھی میں ڈرنے جیسا بچا ہی کیا ہے۔ ایک بڑی بی ہیں، جو پلنگ سے لگی پڑی ہیں۔ صاحبزادے گل چھرے اُڑا رہے ہیں۔ لے دے کر بچی ممتاز.....بیچاری نوکرانی.....
ایک لمحہ رک کر کچھ سوچتی ھے۔ پھر کنکھیوں سے اپنے کمرے کے دروازے کے قریب

بیٹھی، بالیوں میں کنگھا کر رہی، سکینہ کی
طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں
اس گھر میں نوکرانیاں
نوکرانیاں نہیں ہیں یہ تو مہارانیاں ہیں..... مہارانیاں
ایک لمحہ کے لئے سکینہ عظمت کی طرف
دیکھتی ہیں۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ
آکر گذر جاتی ہے۔ وہ پھر کنگھا پھیرنے لگتی
ہیں۔

چھوٹی نانی: جمیلا سے
تو جاتو..... صدر دروازے سے آواز لگا دینا..... وہ تو خود ہی آجائے گی.....

جمیلہ چلے، اُس سے پہلے ممتاز کی آمد

چھوٹی نانی: لو..... آگئی بیگم صاحباں..... ہوگئی تمہاری صبح.....!

ممتاز: میں تو اور پہلے آجاتی۔ لیکن چھوٹے صاحب کے دوچار
دوست آگئے۔ بڑی بی نے تو دو لوگوں کے لایق آٹا تول کر
دِیا اور پھر بستر پکڑ لیا۔ پہلے تو میں پریشان ہوئی۔ پھر کنستر

کھولا اور نکال لیا آٹا.....ان کے بھروسے بیٹھ جاؤ تو بھوکے

پیٹ سوؤ.....

ممتاز چھوٹی نانی کے سامنے سے پرانت کھینچتی

ہے اور اس کے ہاتھ تیزی سے میدہ گوندھنے لگتے

ہیں۔

نانی: ٹھنڈی آہ بھر کر

قدرت کے کھیل ہیں سب..... ہاتھی کی سواری اور چڑیا کا دل.....

سیویاں نہیں بنوار ہے بڑی ڈیوڑھی والے.....

ممتاز: نا نماز، نا روزہ! وہاں کس کو ہوش ہے.....عین وقت پر دوڑیں

گے اور لے آئیں گے بازار سے.....

صغرا: مشین کی بنی سیویاں

چھوٹی نانی: اور کیا.....؟

جمیلا: لاحول ولاقوۃ

بُرا سا منھ بنا کر

موٹی موٹی سخت سخت..... کھاؤ تو لگے جیسے لوہے کے تار چبا رہے ہیں۔

سکینہ نکلنے کے لئے تیار ھیں۔ انھوں نے سفید کپڑے پھنے ھوئے ھیں۔ مٹکے کے اوپر رکھا المونیم کا کٹورہ اٹھا کر جھولے میں ڈال کر پورے کمرے میں کچھ تلاشتی ھیں۔

سکینہ۔ خود سے۔

ہائے میرے مولا..... کہاں چلی گئی.....؟ ابھی تو یہیں تھی..... ارے مشتاق.....او مشتاق

سکینہ کمرے سے نکل کر آنگن کی طرف بڑھتی ھیں۔

سکینہ: پکارتے ہوئے

مشتاق.....

پھر رُک کر

اے ممتاز..... صغرا..... ذرا دیکھو..... میری لاٹھی کہیں دِکھائی دے رہی

ہے..... کیا؟ ابھی مشتاق کے ہاتھ میں تھی..... پتہ نہیں کہاں پھینکی ہوگی.....

ممتاز: وہ اِدھر کونے میں.....صغرا، جا ذرا اماں کو لاٹھی دے دے

صغرا اٹھ کر لاٹھی سکینہ کو تھماتی ہے۔ سکینہ دوپٹے کو ٹھیک سے سِر پر اوڑھ کر چلتی ہیں۔

ممتاز: سویرے۔سویرے.....کہاں نکل پڑی اماں؟

سکینہ: ہنس کر
مُلاّ کی دوڑ مسجد تک.....کہاں جاؤں گی..... جمعہ ہے نا.....وہیں مولا صاحب.....تو آئی نہیں.....اِتّے دِن ہو گئے۔

ممتاز: چھوٹے صاحب بھوپال جائیں گے نہ اِتوار کو.....تب آؤں گی.....

سکینہ: دیکھ لینا.....بھئی تم کام کاج والے لوگ ہو۔

سکینہ آنگن کے دروازے سے باہر چلی جاتی ہیں۔

جمیلہ: نانی..... سکینہ امّا سے سیویاں نہیں بنوائی آپ نے.....

چھوٹی نانی: ارے، اُسے اِن کاموں کی فرصت کہاں؟ صبح سے شام تک اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر..... مجھے لگتا ہے بھنور پڑ گیا ہے اس کے پانوں میں.....

(ممتاز کے علاوہ باقی لوگ ہنس پڑتے ہیں۔)

ممتاز: (سنجیدہ ہو کر) گھومنے دو بیچاریوں کو..... ساری عمر یہی سب تو کیا ہے انہوں نے۔

چھوٹی نانی: (ایک لمبی ہوں کے بعد) اور صاحبزادے..... وہ تمہارے چھوٹے صاحب کیا کر رہے ہیں آج کل؟

ممتاز: وہی..... رات بھر دوستوں کے ساتھ اور دن بھر بستر میں.....

چھوٹی نانی: (دانت پیس کر) چمگادڑ کی اولاد! بیڑا غرق کر دیا پورے خاندان کا۔ تمہارے نانا نے سارے خاندان کی زمینیں چھوٹی بائی کے نام لکھوا دی۔ سوچا تھا وہ جاگیردار بنے گا..... خاندان کا نام روشن کرے گا..... لیکن دونوں بھائیوں کی آنکھ

بند ہوتے ہیں..... اس چھوٹے صاحب نے..... اللہ بھلا
کرے اس کا..... سب کچھ لگنے سے لگادیا..... غلطی تمہارے
نانا کی بھی نہیں تھی..... بھروسے کی بھینس پاڑا دے جائے تو
کوئی کیا کرے۔

ممتاز: نانی، ذرا بڑھانی۔ اے..... صغرا، ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلا۔
(سب سیوئیاں بنانے میں لگ جاتے ہیں)

سین نمبر ۶

دِن/اندر (زنان خانہ)

چھوٹی نانی کے سامنے کاجو، بادام اور کِشمش
ایک پلیٹ میں رکھے ہیں اور وہ ناریل کی گِری
کس رہی ہیں۔ سامنے سکینہ بیٹھی اپنا جھولا
کھول رہی ہے۔

سکینہ: ادھر اُدھر دیکھ کر

مشتاق.....ارے او.....او مشتاق.....کہاں چھپا ہے.....

جھولے سے ایک ٹوپی اور کپڑے نکالتی ھیں۔

سکینہ: دیکھ میں تیرے لیے کیا لائی ہوں.....

مشتاق اندر آتاھے۔وہ رک کر سکینہ کو غور سے معنی خیز انداز میں دیکھتا ھے۔

سکینہ: یہ، یہ لے نا.....وہاں کیوں کھڑا ہے؟

مشتاق دھیمے قدموں سے آگے بڑھاتاھے اور بے من سے سکینہ کے ھاتھوں سے ٹوپی اور کپڑے لے کر واپس چلتا ھے۔ سکینہ اُسے غور سے دیکھتی ھے۔

سکینہ: ارے، ٹوپی سر پر ناپ کے دیکھ.....

مشتاق: نئ.....ٹھیک ہی ہوگی بڑی نانی.....

سکینہ: لگتا ہے چھوٹی ٹوپی کا رنگ پسند نہیں آیا..... کوئی بات نہیں..... وہ تو بدل جائے گی..... میں دوکاندار سے بول کر آئی ہوں.....

مشتاق: نہیں..... اچھی ہے.....

سکینہ: اچھا، میں سمجھ گئی..... تو جُوتے کی وجہ سے منہ پھُلا ہوا ہے..... اب اِس میں میری کیا غلطی..... ناپ دیا ہوتا تو وہ بھی لے آتی.....

مشتاق: جُوتا تو میرا ابھی نیا کا نیا رکھا ہے۔

مشتاق اندر چلا جاتاھے۔وہ ھاتھ کی ٹوپی اور کپڑوں کو دیکھ رھاھے اور کسی خیال میں ڈوبا ھوا ھے۔ لمحہ دو لمحہ بعد ھم دیکھتے ھیں کہ اس کے چھرے کا تناؤ غائب ھوجاتاھے۔ وہ ٹوپی اور کپڑے پلنگ پر پٹکتا ھیاور پلٹ کر دالان کی

طرف بڑھتاھیط لیکن چھوٹی نانی اور سکینہ کی باتیں سن کر اُس کے قدم وهیں ٹھٹھک جاتے ھیں۔ سکینہ کے هاتھ میں کپڑے ھیں، جو وہ چھوٹی نانی کی طرف بڑھا رھی ھیں۔

سکینہ: یہ کرتا پاجامہ اور ٹوپی..... مرزا جی کے نام پر کسی کو خیرات کر دینا۔

چھوٹی نانی: تنک کر
تم پھر لے آئی..... میں نے کہا تھا نا، ابھی میرے ہاتھ پانوں سلامت ہیں..... جس دن میں مر جاؤں اُس دن تم یہ سب کرنا۔

سکینہ: مجھے جو کرنا تھا..... میں نے کر دیا..... اب تم جانو تمہارا کام جانے۔

سکینہ جھولے میں سے سِگوں کی چھوٹی سی پوٹلی نکال کر چھوٹی نانی کے سامنے رکھتی ھے۔

سکینہ: یہ شہزادی کو بھجوا دینا۔ ویسے بھی اُس کا ہاتھ تنگ رہتا ہے.....
پھر آج کل چھٹکی بھی بیمار ہے.....

چھوٹی نانی: تلملا کر

ارے..... اگر ایسی ہی ہمدرد ہو تو خود جا کر دو نا..... میرے منھ پر کیوں مار رہی ہو..... یہ تو ہوا نہیں کہ کبھی بچی کو جا کر دیکھیں، اس کے سر پر ہاتھ پھیریں..... لینا نہ دینا..... ہائے باپ..... ہائے بہنا.....

سکینہ اپنا جھولا سمیٹتی ہے

سکینہ: اب تم چیخو چلاؤ مت..... تمہارے چلاّنے سے میرا کلیجہ منھ کو آتا ہے.....

سکینہ اٹھ کر لاٹھی ٹیکتی ہوئی چلی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ مشتاق آہستہ آہستہ چھوٹی نانی کی اور بڑھتا ہے۔

مشتاق: نانی..... بڑی نانی میرے لئے کپڑے لائی ہیں..... نانا کے نام پر خیرات کرنے کے لئے جوڑا لائی ہیں..... ماں کو پیسے

بھجوا رہی ہیں..... پھر آپ اُن پر غصہ کیوں کر رہی ہیں؟

چھوٹی نانی: تم بچے ہو..... تم کیا جانو..... میں نے بہت دیکھے ہیں ایسی مدد کرنے والے..... یہ کون اپنی جیب سے دے رہی ہیں

سِگوں کی پوٹلی اٹھا کر اپنے قریب رکھتے ہوئے۔

تمہارے نانا کا سارا مال دبائے بیٹھی ہے..... ورنہ اس کے پاس کیا قارون کا خزانہ دبا ہوا ہے..... میں، تمہیں بتا رہی ہوں..... تمہارے نانا کے پاس سونے کے اِتنے بڑے بڑے لڈو ہوا کرتے تھے..... جب بھی ضرورت پڑتی تھی، انہیں میں سے سونا کاٹ کر بیچ دیتے تھے، اُدھر ان کی آنکھ بند ہوئی اور لڈو غائب..... تو گئے کہاں وہ لڈو؟ زمین نگل گئی یا آسمان میں ہوا ہو گئے..... اس لئے تو اپنے صندوق پر کنڈلی مار کر بیٹھی رہتی ہیں.....

مشتاق: ایک لڈّو تو آشارام جی کے پاس رگروی پڑا ہے نا.....؟

چھوٹی نانی: پریشان ہو کر

چلو ایک وہ ہوا..... باقی کہاں گئے.....؟

مشتاق معنی خیز انداز میں ایکٹک چھوٹی نانی کا

چہرہ دیکھتا ھے۔

سین نمبر ۷

ایک لمبی گلی کے کونے سے چار پانچ فقیر چمٹا ڈھولک بجاتے ہوئے آگے بڑھ رھیھیں۔ وہ نظیر اکبر آبادی کی نظم گا رہے ھیں۔

فقیروں کی آواز کورس میں

روزے کی خوشیوں سے ہیں زرد زرد گال،
خوش ہو گئے وہ دیکھتے ہی عید کا حلال،
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید گال،
دِل کیا کے ہنس پڑا ہے تن کا بال بال،
ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی،
جیسی کی ہر اک دل میں ہے اس عید کی خوشی۔

ساتھ میں ہم دیکھتے ھیں کہ چند لوگ آپس میں عید مل رہے ھیں۔ کچھ لوگ فقیروں کو کپڑے، پیسے اور اناج دے رہے ھیں۔ اُن میں مشتاق

اور سکینہ بھی ہے۔

دالان میں بچھے تختوں پر صاف ستھری سفید چادریں بچھی ہیں۔ گاؤ تکئے لگے ہیں۔ زنانخانے اور مردانخانے میں عید کا ماحول ہے۔ سیوئیوں کا دور چل رہا ہے۔ زنانخانے میں محلے کی چند عورتوں کے بیچ شہزادی، ممتاز، سکینہ اور چھوٹی نانی بیٹھی ہیں۔ چھوٹی نانی زنانخانے اور مردانخانے کے بیچ پڑی چِخ کے قریب بچھی چوکی پر بیٹھی ہیں۔ سکینہ کے ہاتھ میں سیوئیوں کا پیالہ ہے۔ آف د اسکرین فقیروں کے گانے کی آواز آہستہ آہستہ ہلکی ہو جاتی ہے۔

شہزادی: بڑی نانی کو مشتاق کیا مل گیا...... ہمیں بھول ہی گئیں...... چھٹکی بیمار ہو کر تڑپتی رہی، لیکن بڑی نانی نے آ کر جھانکا تک نہیں......

سکینہ: اب...... کال کوس میں تمہارا گھر...... پھر اتنی سیڑھی چڑھنے کی اب مجھ میں ہمت کہاں......

صغرا: سکینہ کو چھیڑنے کے انداز میں

نانی کو تو بس سڑکیں ناپنے میں ہی مزا آتا ہے۔

سکینہ: اب مزا ہے یا مجبوری یہ میں جانوں اور میرا خدا جانے...... تم کیا جانو......

شہزادی اپنی بیٹی چھٹکی کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ چھٹکی ماں کی گود میں سے اٹھ کر سکینہ کی گود میں جا بیٹھتی ہے۔

چھٹکی: بڑی نانی مجھے سونے کی چھم چھم بنوادو......

سکینہ: ہنس کر

ہاں...... بیٹا...... اللہ سے دعا کرو...... وہ چاہے تو بن بھی جائے گی۔

شہزادی: بڑی نانی، بچّی نے کتنے پیار سے پہلی بار کچھ مانگا ہے...... دے دو نہ نکال کر......

سکینہ: بگڑ کر

کیا دے دوں...... اپنا کلیجہ نکال کر دے دوں......

جس دن یہ سانس رک جائے...... اُسی دن ان ہڈیوں کو پگھلا کر...... جس کو جو بنوانا ہو...... بنوالینا......

شہزادی: طنز اور شرارت سے

بری نانی، اتنی ساری ہڈیوں کا ہم کیا کریں گے؟...... ہمیں تو بس صندوق کی چابی دے دینا......۔

سبھی لوگ زور سے ہنس پڑتے ہیں۔ سکینہ کھسیا کر اٹھتی ہیں سیوئیوں سے بھرا پیالا چھوڑ کر۔

سکینہ: صندوق لے لینا...... چابی لے لینا...... برتن لے لینا...... رکابی لے لینا۔ میں کون سب کچھ قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔

شہزادی: بڑی نانی...... سیوئیاں تو کھالو......

سکینہ بنا کوئی جواب دیئے لاٹھی ٹیکتی ہوئی چل پڑتی ہے۔

چھوٹی نانی: ڈانٹ کر

تم لوگ بزرگ کو بزرگ نہیں سمجھتے...... ایک ساتھ سب بھکمنگوں کی طرح

ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ گئے۔اور وہ سکینہ بھی...... نہ منھ میں دانت...... نہ پیٹ میں آنت...... بچوں کی باتوں کا برا مان کر چل دی۔

مردان خانہ میں عبّاس,نند کشور,ظہیر، مشتاق اور مشتاق کے ہم عمر دو چار لڑکے بیٹھے ہیں۔ سیوئیوں کا دور چل رہاہے۔ ایك کون پر فوجی لباس پہنے کالی چشمہ لگائے کالے خاں بیٹھا اوٹ پٹانگ طریقے سے سیوئیاں کھا رہاہے۔ بچّے اسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ظہیر کی گود میں چھٹکی ہے۔ تبھی آشارام داخل ہوتاہے۔ اُس نے لمبا کرتا پھن رکھا ہے اور دھوتی باندھ رکھی ہے۔ سِر پر کالی ٹوپی ہے۔ آشارام کو دیکھتے ی ظہیر اور عبّاس کھڑے ہوجاتے ہیں۔......

ظہیر: آیئے......آیئے......آشارام جی۔

آشارام: عید بہت بہت مبارک ہو۔

آشارام پہلے ظہیر سے، پھر عباس سے عید ملتاھے۔ تبھی مشتاق عطردانی لے کر آگے بڑھتاھے اور آشارام کو عطر لگاتاھے آشارام تخت پر جاکر بیٹھ جاتے ھیں، تو مشتاق عطردانی ایک طرف رکھ ٹرے میں رکھی سیوئیوں کی پیالیاں آشارام کے پاس لے جاتاھے۔ آشارام ایک پیالی اٹھاکر سیوئیاں کھانے لگتاھے۔......

آشارام: کچھ بھی کہو صاحب......اب تہواروں کا وہ مزہ کہا؟

عباس: عید ہو یا دیوالی......تہوار تو ایک بہانہ ہے...... ملنے جلنے کا......خوشی منانے کا......رہی بات مزے کی......تو وہ تو دل اور دماغ میں ہوتا ہے۔ اب ان بچوں کو دیکھیے نہ...... کیسے مگن ہیں......

نندکشور: عباس چچانے بات تو صحیح کہی ہے۔

آشارام: نندو، اسی گھر میں......تم نے مرزاجی کا زمانہ دیکھا ہوتا، پھر

کہتے...... کیا رونق ہوا کرتی تھی۔

عباس: آشارام، بات تمہاری کسی حد تک تو صحیح ہے، لیکن چیزیں وقت کے ساتھ بدلتی بھی ہیں۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) بچوں کے سامنے کیا کہوں...... نہ تو اب تمہار اراتوں کو کھڑکیاں کودنے کا زمانہ رہا۔

آشارام: اور نہ سائیکل پر بیٹھ کر سیٹیاں بجانے کا آپ کا زمانہ رہا......

دونوں قہقہہ لگاتے ہیں۔ ساتھ میں بچے بھی ہنستے ہیں۔ تبھی میاں وھیل چیئر پر بیٹھے دالان میں داخل ہوتے ہیں۔ میاں کو دیکھ کر عباس، نندو، آشارام سبھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نندو آگے بڑھ کر۔

نندو: میاں...... آداب...... عید مبارک ہو۔

میاں تسبیح ہاتھ میں لئے ہی نندو سے ہاتھ ملاتے ہیں......

میاں: کہاں رہتے ہو، بیٹے؟

نندو: گولمانڈی میں۔

میاں: کیا نام ہے؟

نندو: نندکشور جوشی۔

میاں: والد کا نام؟

نندو حیرانی سے اِدھر اُدر دیکھتا ہے۔تبھی عباس آگے بڑھ کر

عباس: میاں......اپنے راج کشور جوشی کے صاحب زادے ہیں یہ

میاں: نندوسے

بیٹے، ہندو ہو یا مسلمان؟

میاں کے اتنا کہتے ہی سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ چھوٹی نانی اس پر ایکدم تڑپ اٹھتی ہیں اور چِخ ہٹا کر مردان خانے میں آتی ہیں......

چھوٹی نانی: زور سے جھپٹ کر

کیا بدتمیزی ہو رہی ہے......خاموش......

چھوٹی نانی میاں کی وھیل چیئر دھکیل کر اندر لے جاتی ہیں۔ سب لوگ خاموش دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

آشارام آگے بڑھتے ہیں۔پیچھے سے ظھیر انھیں پکارتا ھے ظھیر کی گود میں چھٹکی ھے۔

ظہیر: ارے آشارام جی

آشارام: ہاں...... ظہیر بھیا، بولو

ظہیر: مجھے پچھلے اتوار کو ہی آپ کے پاس آنا تھا، لیکن

آشارام: کوئی بات نہیں...... ویسے بھی تہوار کے دن لین دین کی بات کیا کرنا......

چھٹکی کے گال کو چھو کر

یہ بتاؤ بٹیا کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا......

ظہیر: یہ تو آپ کی دعا سے...... بالکل ٹھیک ہے اب......

آشارام: تو ٹھیک ہے، آپ عید منایئے...... ہم تو کبھی بھی مل لیں گے......

آشارام باہر جاتے ہیں

چھوٹی نانی منھ ڈھکے بیٹھی ہیں

شہزادی: اماّ......اب ختم بھی کرو......لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔

چھوٹی نانی: لگ بھگ رونی آواز میں

بھیا کو دیکھتی ہوں تو میرا رُواں رُواں روتا ہے۔ ارے وہ ہنسنے کی، تماشے کی چیز ہیں کیا؟......

ان کے درد کو سمجھنے والا ہے کوئی نہیں بچا......

خود سے۔

بدقسمت ہیں وہ لوگ جنھوں نے بھیا کا شباب نہیں دیکھا......ڈاکٹر مرزا اقبال بیگ...... ہر محفل کی جان۔ شہر کی ہر گلی...... ہر کوچے میں ان کی قابلیت کے چرچے...... عقل مند، پرخلوص، دیانت دار...... خوبصورت...... قد آور......کون سی خوبی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب یہ لندن سے ڈاکٹری کی پڑھائی کر کے لوٹے تھے، سارا شہر اس ایک شخص کے اِرد گرد گھومتا تھا۔ پہلے سرکاری نوکری کی، پھر اپنا چھوٹا سا اسپتال کھولا۔ صبح سے شام تک مریضوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے۔ ہاتھ میں ایسی شفا تھی......دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔

فلیش بیک-I

سین نمبر۹

(ڈاکٹر مرزا اقبال بیگ کا دواخانہ)

ڈاکٹر اقبال بیگ کے دواخانے کا منظر۔ ڈاکٹر اقبال سیڑھیاں اُتر رہے ہیں۔ عمر پچاس۔پچپن کے قریب۔ انھوں نے شرٹ پینٹ پھنی ہوئی ہے اور ٹائی لگا رکھی ہے۔ ھاتھ میں فلیٹ ہیٹ۔ ڈاکٹر تیزی سے سیڑھی اُتر کر لان میں آتے ہیں اور وہاں کھڑی بیل گاڑی کو دیکھ کر چونک جاتے ہیں۔

ڈاکٹر: چوکیدار سے

یہ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟

چوکیدار: مریض آئے ہیں صاحب

ڈاکٹر چاروں طرف نظر ڈالکر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے یں۔تبھی وہ دیکھتے ھیں کی راستے میں چند گاؤں والے بیٹھے ھیں۔ماں۔باپ کے

ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے،جسنے اپنے دونوں ھاتھ
اوپر اٹھا رکھے ھیں۔ڈوکٹر کو دیکھتے ھی لرکی
کا باپ ھاتھ جوڑ کر کھڑا ھو جاتا ھے......

ڈاکٹر: کیابات ہے؟

باپ:لڑکی کی طرف اشارہ کر کے۔

ڈاکٹر با......سوکراٹھی تھی......انگڑائی لی......بس ہاتھ اوپر کے اوپر رہ گئے۔

ڈاکٹر: حیرانی سے لڑکی کو دیکھ کر۔

ارے بھائی،تو کسی سے مالش۔والش کراؤ...... یہاں کیوں لے آئے
اسے......۔

باپ: گڑگڑا کر۔

ڈاکٹر با...... چھ مہینے بیت گئے،ڈاکٹر،حکیم ، وید سب کے پاس گھوم
لیا...... جادو ٹونا کر لیا......لیکن...... اب اس کا جیون آپ کے ہاتھ
میں ہے۔

ڈاکٹر بھت غور سے لڑکی اور اس کے ماں باپ پر
نظر ڈالتے ھیں۔

ڈاکٹر: نرس کو پکارتے ہوئے

سسٹر......انہیں ایک بیڈ دے دو......

سین نمبر ۱۰

ڈاکٹر کا کمرہ

ڈاکٹر ایک مریض سے بات کر رہے ہیں۔ قریب ہی لڑکی کا باپ بیٹھاہے۔ پہلا مریض اٹھ کر جاتا ہے......

پِتا: ڈاکٹر با...... پورا ہفتہ بیت گیا...... نہ کوئی دوا نہ دارو...... آپ نے چھوری کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ڈاکٹر: سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے

سوچ رہا ہو...... کیا دوا دوں......

باپ: سنجیدہ ہو کر

چھ مہینے پہلے ہی منگنی کی تھی...... اب بیاہ کی تاریخ کس منہ سے مانگوں...... جو خود کو نہیں سنبھال سکتی...... گھر کیا سنبھالے گی...... جو خود کھا نہیں سکتی...... دوسروں کا پیٹ کیسے پالے گی؟

ڈاکٹر: سنجیدہ انداز میں سوچتے ہوئے

اس کا منگیتر کہاں ہے؟

باپ: اُنہیل میں......

ڈاکٹر: بلوا سکتے ہو اُسے؟

باپ: سوچ کر

کسی کو بھیجنا پڑے گا

ڈاکٹر: بھیج دو......اور بلوا لو اُسے......پھر دیکھتے ہیں۔

سین نمبر ۱۱

ڈاکٹر کا کمرہ

لڑکی کے باپ کے ساتھ بیس سال کا ایک نوجوان اور اس کا باپ بیٹھے ھیں۔

باپ: ڈاکٹر با...... یہ ہیں ٹھاکر لکشمن سنگھ...... میری بیٹی کے سسُر
اور یہ جوائیں پرکاش سنگھ

ڈاکٹر: دونوں کو غور سے دیکھ کر ٹھاکر سے
بھئی، آپ کی ہونے والی بہو کی حالت آپ کو پتہ ہے......

ٹھاکر: (ہاں میں گردن ہلاتا ہے)

ڈاکٹر: ہم پوری کوشش کر رہے ہیں...... لیکن اگر کچھ نہیں ہو پایا تو اُس کا کیا ہوگا؟

ٹھاکر: میں تو اس کا ہاتھ مانگ چکا ہوں...... اب وہ میری بیٹی ہے...... جیسی یہاں ہے...... ویسی ہی میرے گھر میں رہے گی......

ڈاکٹر: خوش ہو کر باپ کی طرف دیکھتے ہیں
لو، اب تو تم خوش ہو......

باپ: سنجیدہ ہو کر

لیکن ڈاکٹر با......

ڈاکٹر: اچھا...... اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو...... میں ذرا اس نوجوان سے بات کرنا چاہتا ہوں......

لڑکی کا باپ اور لکشمن سنگھ دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نوجوان کو کچھ سمجھاتے ہیں اور لڑکا ہاں میں ہاں کر رہا ہے۔ اگلے ہی لمحہ ڈاکٹر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکا بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

سین نمبر ۱۲

نوجوان لڑکا ایک بند دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ چاروں طرف نظر ڈالتا ہے اور پھر

آہستہ سے دروازہ کھولتاہے۔ اندر کمرے میں لڑکی لیٹی ہوئی ہے، جس کے دونوں ہاتھ سر کی طرف پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایکٹک چھت کو گھور رہی ہے۔ آہٹ سن کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور اپنے منگیتر کو یوں چوروں کی طرح کمرے میں گھستا دیکھ چونکتی ہے۔ لڑکا لڑکی کے قریب جاتا ہے۔ لڑکی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ لڑکا اور قریب جاتا ہے۔ لڑکی آہسہ آہست سے آنکھیں کھولتی ہے۔ لڑکے کو اور قریب پاکر وہ شرم سے منھ چھپانا چاہتی ہے۔ لڑکا اُس کے پاس پہنچ کر اُسے چھُونا چاہتا ہے۔ لڑکی کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس جاتی ہے۔ لڑکا لڑکی کے بلاؤز کا ایک بٹن کھولنا چاہتا ہے۔ لڑکی چیخنا چاہتی ہے، لیکن چیخ نہیں پاتی۔ لڑکا لڑکی کے بلاوز کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتاہے۔ تبھی لڑکی اپنی پوری طاقت سے ہاتھوں کو نیچے لانے

کی کوشش کرتی ہے اور اگلے ہی لمحہ لڑکی دونوں ہاتھوں سے لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ اور اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ تبھی ڈکٹر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے وہ لڑکی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہیں اور لڑکی کے ہاتھوں کی جانچ کرتے ہیں۔ اس بیچ کمرے میں ٹھاکر اور لڑکی کے ماں باپ داخل ہوتے ہیں اور لڑکی کے ہاتھوں کو ٹھیك ٹھاك دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھنے لگتے ہیں......

باپ: دونوں ہاتھ جوڑ کر

ڈاکٹر با......

جذبات کی رو میں کچھ کھہ نہیں پاتاھے

ڈاکٹر: باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

اب تو خوش ہونا...... جاؤ اور اپنی لاڈلی کا بیاہ رچانے کی تیاری کرو۔

سین نمبر ۱۳

فلیش بیک ختم / نانی کا کمرہ

چھوٹی نانی: فرض کے آگے انہوں نے کبھی کسی دیگر بات کو اہمیت نہیں دی۔ ایک بار...... ہاں شاید وہ بقرعید کا موقعہ تھا......

فلیش بیک-II

اسپتال کا منظر۔ لان میں ڈاکٹر اقبال چند لوگوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ وہ لوگ عید کی نماز کے لئے روانہ ہونے کو تیار ہیں۔ تبھی اسپتال کے دروازے میں چند لوگ ٹیمپو داخل ہوتے ہیں۔ سب لوگ ان کی طرف دیکھتے ہیں۔......

ڈاکٹر: اپنے آس پاس کے لوگوں سے
ذرا دیکھو بھئی......کون ہیں؟

تبھی چند زخمیوں کو اندر لایا جاتا ہے۔

جاتاھے۔

ڈاکٹر: آگے بڑھ کر کیا بات ہے؟

ٹیمپو والا: ڈاکٹر صاح، ایکسیڈینٹ ہوگیا ہے......

ڈاکٹر: زخمیوں پر ایک نظر ڈال کر
ارے بھئی، انہیں سرکاری اسپتال لے جاؤ...... ایکسیڈینٹ کا کیس ہے...... یہاں کچھ نہیں ہو پائے گا۔

ٹیمپو والا: ڈاکٹر صاحب، وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو یہ سب دم توڑ دیں گے۔

ڈاکٹر: اپنے کمپاؤنڈر سے
ان کی تھوڑی بہت مرہم پٹّی کردو۔

کمپاؤنڈر دوڑ کر مرھم پٹی کا سامان لاتاھے اور ایك دو مریضوں کی مرھم پٹّی کی جاتی ھے۔ تبھی ڈاکٹر کی نظر ایك بوڑھے سادھو پر جو لگ

بھگ بے ہوش ہے......

ڈاکٹر: ارے بھئی......اسٹریچر لاؤ......اسے اندر لے چلو۔

دو لوگ دوڑ کر اسٹریچر لاتے ہیں اور سادھو کو آپریشن کے کمرے میں لے جایا جاتاہے۔ اس بیچ باقی لوگس کی مرہم پٹّی کی جاچکی ہے۔ کافی دیر بعد آپریشن کے کمرہ کادروازہ کھلتاہے اور ڈاکٹر باھر نکلتے ہیں...... ان کے دستانے خون سے سنیھیں۔ شیروانی اور پایجامے پر بھی ھلکے سے خون کے داغ ھیں۔ ڈاکٹر ان کے انتظار میں کھڑے عید گاہ جانے کو تیار لوگوں سے

ڈاکٹر: ارے بھائی، تم لوگ گئے نہیں؟ جاؤ بھائی، آپ لوگوں کی نماز رہ جائے گی......

ایک شخص: ہم تو آپ کے انتظار میں ہیں......چلئے نہ آپ بھی۔

ڈاکٹر: ایک نظر اپنے کپڑوں اور ایک نظر اپنے خون سے سنے دستانوں پر ڈاکٹر، معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ
اپنی نماز تو ہوگئی

سین نمبر ۱۴

فلیش بیک ختم رچھوٹی نانی کا کمرہ

چھوٹی نانی: بھائی جان کا وہ چہرہ آج بھی میری آنکھوں میں گھومتا ہے...... لیکن قسمت کو وہ سب کہاں منظور تھا......

ایک دم حیوانیت کا ایسا دور آیا...... درندوں نے شہر کی سڑکیں لاشوں سے پاٹ دیں۔ رگوں کا خون نالیوں میں بہہ چلا...... اور اُس طوفان کے بیچ بھائی جان چیخ چیخ کر دیوانوں کی طرح ہر ایک کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ذہنوں میں ایسا زلزلہ آیا ہوا تھا...... کہ ہر شخص اپنی اور اپنوں کی شناخت بھول گیا تھا۔ انسان محض ہندو اور مسلمان بن کر رہ گیا تھا۔ وقت کی وہ آندھی بھائی جان کے دل و دماغ سے سبھی کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے گئی، سوائی اسی ایک سوال کے...... کہ تم ہندو ہو یا مسلمان......

ظہیر: غلطی ہماری ہے...... ہمیں میاں کا خیال رکھنا چاہئے......

چھوٹی نانی: قصور صرف تمہارا نہیں...... زمانہ ہی ایسا آگیا ہے...... چیزوں کو گہرائی سے دیکھنے...... سمجھنے کی فرصت کسی ہے......

آنسو پونچھتے ہوئے کچھ سہج ہونے کی کوشش میں چھوٹی نانی

خیر.... ان بھولے بھالے لوگوں کی زندگی میں آگ لگانے والوں کو.... اللہ دیکھے گا۔

سکینہ کا کمرہ/سین نمبر ۱۵

سکینہ بستر پر لیٹی ہیں۔ پاس ہی مشتاق بیٹھا ہے

سکینہ: ذرا مجھے دو گھونٹ پانی تو دے دو۔

مشتاق کٹورے میں پانی لا کر دیتا ہے......

مشتاق: بڑی نانی...... بخار اُتارنے کے لئے تو کڑوی دوا پینی پڑے گی......

سکینہ: بیحد کمزور آواز میں

یہ بخار مُوا میری ہڈیوں میں گھسا جارہا ہے...... عجیب سی گھبراہٹ ہے...... تُو تو ایسا کر...... جا کر ممتاز کو بلالا......

سکینہ پانی کا کٹورہ مشتاق کو تھماتی ھے۔ مشتاق کٹورہ مٹکے پر ڈھک کر دروازے سے باھر چلا جاتاھے۔ سکینہ دوبارہ لیٹ جاتی ھے۔ مشتاق کو آنگن میں سے گذرتا دیکھ چھوٹی نانی۔

چھوٹی نانی: اے...... مشتاق...... اِدھر آ تو نا

مشتاق قریب آتاھے......

چھوٹی نانی: کہا جارہے ہو؟

مشتاق: ممتاز بائی کو بلانے۔

چھوٹی نانی: کیوں؟

مشتاق: بڑی نانی کو بخار چڑھ گیا ہے...... کہہ رہی تھیں...... ممتاز کو بلا دو۔

چھوٹی نانی: دیکھا اس عیب دار کو...... سارے شہر میں ڈھنڈورہ پیٹے گی...... لیکن مجھ سے نہیں کہے گی...... تو ٹھہر ذرا......

وہ اٹھتی ہے۔پاس کی الماری سے کچھ شیشیاں اور ڈبّے نکالتی ہیں اور کاغذ کے ٹکڑے پر دو تین طرح کے پاؤڈر ملانے لگتی ہیں......

مشتاق: بڑی نانی کا اپنا کوئی...... بیٹا...... بیٹی نہیں ہیں؟

چھوٹی نانی: تم سب ہوتو سہی۔

مشتاق: ایسے نہیں......

چھوٹی نانی: قسمت کی ماری کا ایک بیٹا تھا......لیکن وہ جوان ہوتے ہوتے دنیا سے سِدھار گیا......

مشتاق: بس......اور کوئی نہیں

چھوٹی نانی: ہم نے تو نہیں دیکھا......تمہاری پرنانی بتاتی تھیں......کبھی کہیں سوکھا پڑا تھا......لوگ دانے دانے کے محتاج ہو گئے تھے۔ مصیبت کے ماروں کو، اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو......دُدھ منھوں تک کو بیچنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ سکینہ بھی اسی طرح اس گھر میں آئی تھی...... پرنانی نے ہی پال پوس کر بڑا کیا۔ (مشتاق کو پڑیا تھما کر یہ لے)...... کہنا ایک دو خوراک لے گی تو بخار جاتا رہے گا......اور یہ بھی بول دینا کہ چولہا چکّی سے نہ لگے......میں کھچڑی بنا کر بھجوادوں گی۔

مشتاق دوا لے کر چلا جاتاھے چھوٹی نانی ڈبے، شیشیاں واپس رکھنے لگتی ھیں۔ تبھی مشتاق کی آواز سنائی پڑتی ھے۔

مشتاق: نانی...... نانی...... جلدی آؤ...... بڑی نانی کو کیا ہو گیا......

چھوٹی نانی: سب کچھ چھوڑ کر اُٹھتے ہوئے
یا خدا خیر......

سکینہ پلنگ پر لیٹی ھیں۔ چھوٹی نانی اس کے سِر پر ھاتھ رکھتی ھیں۔ پھر نبض ٹٹولتی ھیں......

چھوٹی نانی: روتے ہوئے
قالو اِنالِلّٰہ و اِنا الیہ راجِعون۔

چھوٹی نانی کو روتا دیکھ مشتاق اُن سے چپٹ کر رو پڑتا ھے۔

سین نمبر ۱۶

دالان میں لمبا چوڑا فرش بچھا ہے جس پر کئی بچے اور عورتیں بیٹھی قرآن پڑھ رہی ہیں۔ انھیں کیبیچ چھوٹی نانی، شہزادی بھی ہیں۔

چھوٹی نانی: شہزادی، ذرا کسی کو بھیج کر...... آشارام کو تو بلوالو......

شہزادی: کیوں...... کیا بات ہے؟

چھوٹی نانی: ارے بھئی...... کفن دفن کا انتظام کرنا ہے کیا؟

شہزادی: بڑی نانی کا صندوق کھول لو نہ...... وہ کس دن کام آئے گا۔

چھوٹی نانی: جھنجھلا کر
مجھے تو کسی بات کی سُدھ ہی نہیں بن رہی...... تم جو چاہو کرو......

ممتاز داخل ہوتی ہے

ممتاز رومال کھول کر ایک کے بعد ایک نوٹوں کی دو گڈیاں چھوٹی نانی کو دیتی ہے۔

ممتاز: یہ دو سو روپے کفن دفن کے لئے اور یہ دو سو روپے تیجے کی فاتحہ کے لئے...... اماں نے پہلے ہی میرے پاس رکھوا دیئے تھے۔

چھوٹی نانی کے ہاتھ کے نوٹوں کو مٹھی میں بند کرتی ہے۔ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کی دھار بہے لگتی ہے۔

چھوٹی نانی: (دوپٹے کو آنکھوں سے لگا کر)
اللہ انہیں جنت نصیب کرے...... مر کر بھی مجھے مات دے گئی۔

شہزادی اٹھتے ہوئے

شہزادی: امی...... وہ چابی کہاں ہے...... صندوق کی؟

چھوٹی نانی: اُکتا کر

وہیں ہوگی، جہاں ہوتی ہے۔

شہزادی: تھوڑا آگے بڑھ کر

مشتاق بیٹے..... بڑی نانی اپنے صندوق کی چابی کہاں رکھتی تھیں؟

مشتاق: دوپٹے کے پلو میں۔

شہزادی سکینہ کے کمرے کی طرف بڑھتی ہے۔
تبھی مشتاق جیب سے چابی نکال کر

مشتاق: امّاں چابی تو اب میرے پاس ہے۔

شہزادی مشتاق کے ہاتھ سے جھپٹ کر چابی لے لیتی ہیں۔ مشتاق ہڑبڑا کر شہزادی کو دیکھتا ہے۔ شہزادی چاروں طرف نظر دوڑاتی ہے اور مردان خانے کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن تبھی ظہیر چھٹکی کو گود میں لئے آتا ہے۔ شہزادی

لگ بھگ دوڑ کر ظہیر کے نزدیک پہنچتی ہے۔

شہزادی: میں آپ کو ہی ڈھونڈھ رہی تھی...... سب لوگ تو ادھر اُدھر لگے ہیں۔

چابی دکھا کر

چلیے، ہم بڑی نانی کا صندوق کھول کر دیکھتے ہیں۔

ظہیر کا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ مشتاق اپنے ماں باپ کو حیرانی سے دیکھ رہا ہے ظہیر اور شہزادی سکینہ کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ دونں خوشی خوشی کمرے کے اندر جاتے ہیں۔ لیکن پاتے ہیں کہ سکینہ کے صندوق پر مشتاق بیٹھا ہے۔ مشتاق کو صندوق پر بیٹھا دیکھ شہزادی اور ظہیر معنی خیز انداز سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

شہزادی: مشتاق سے
ذرا صندوق پر سے اٹھو تو......

مشتاق: میں نہیں اٹھوں گا۔

ظہیر: بیٹے...... اٹھو تو...... ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ تمہاری بڑی نانی تمہارے لئے کیا کیا چھوڑ گئی ہیں؟

مشتاق: ابو ...... میں یہ صندوق کسی کو نہیں کھولنے دوں گا......

ظہیر: چابی دِکھا کر
اچھا چلو...... تم خود کھول لو

مشتاق: نئ ابو، صندوق نہیں کھلے گا۔

شہزادی: اٹھتا ہے کہ لگاؤں ایک...... کچھ زیادہ ہی اِترانے لگا ہے...... اے......

(اسی بیچ چھوٹی نانی اور ممتاز داخل ہوتی ہیں)

چھوٹی نانی: کیا بات ہے بھئی...... ایسے وقت میں یہ مار پیٹ کس بات کی۔

ظہیر: کچھ نہیں امّی...... ہم لوگ بڑی نانی کا صندوق کھولنا چاہ رہے تھے...... لیکن لگتا ہے مشتاق کو صندوق پسند آ گیا ہے......

مشتاق سے

بیٹے، بس دو منٹ کے لئے ہٹ جاؤ...... پھر یہ چابی اور صندوق ہم تمہیں ہی دے دیں گے......

شہزادی: غصّے سے

ایسے نہیں مانے گا یہ......

چھوٹی نانی: اچھا بھائی...... یہ قصہ ختم کرو......

مشتاق: چھوٹی نانی...... یہ لوگ بڑی نانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے......

چھوٹی نانی: اچھا...... چلو تم ہی بتادو...... تم کیا جانتے ہو؟

مشتاق اٹھ کر چھوٹی نانی کے قریب آتاھے......

مشتاق: چھوٹی نانی، تم بھی نہیں جانتی......

چھوٹی نانی: تو بتاؤ... کیا بتانا چاہتے ہو۔

مشتاق ایک نگاہ سب پر ڈالتاھے۔

مشتاق: (خیالوں میں کھوئے ہوئے)

عید سے پہلے...... اُس دن آخری جمعہ تھا...... بڑی نانی مجھے راستے میں ملیں...... میں نے ضِد کی...... مجھے نئیں گیند دِلا دو...... انہوں نے مجھے ایک چونی تھمائی اور بولیں...... جاتو لے لے...... میں تو ابھی درگاہ جارہی ہوں۔ گھر آیا تو...... چھوٹی نانی، آپنے مجھے نہانے کے لئے بھیج دیا۔ میں نماز پڑھنے مرزا واڑی کی مسجد میں پہنچا تو وہاں نماز ہو چکی تھی۔ میں دوڑ کر موچیوں کی مسجد پہنچ گیا۔ نماز پڑھ کر نکلا تو مسجد کے باہر فقیروں کی قطار لگتی تھی۔ لوگ انہیں سکے دیتے ہوئے چلے جارہے تھے...... تبھی مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں بھی ایک چونی پڑی ہے...... اور مجھے گیند خریدنی ہے۔ جیب سے چونی نکالی تو وہ ہاتھ سے پھسل گئی اور لڑھکتی ہوئی...... ایک کٹورے سے جا ٹکرائی...... میں چونی اٹھانے کے لئے جھکا تو میری

نظر کٹورے پر پڑی...... المونیم کا نقاشی دار، چمکدار کٹورہ...... کٹورہ مجھے پہچانا سا لگا...... پر میری نظر کٹورے کے قریب رکھی لاٹھی پر پڑی...... وہی لاٹھی...... زمین سے ٹکرا ٹکرا کر جس کی داڑھی نکل آئی تھی...... وہی لاٹھی...... جس سے میں پتنگ نکالتا تھا...... پھر میں نے دیکھا کہ سفید دوپٹے میں کوئی گٹھری بنا بیٹھا ہے...... میں پہچان گیا...... بڑی نانی کو یوں فقیروں کی قطار میں بیٹھا دیکھ میں گھبرا گیا...... گھبراہٹ میں ہاتھ کی چونّی چھوٹ کر ان کے کٹورے میں گر گئی...... میں ڈر گیا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لیں...... میں دوڑ کر گھر آ گیا...... پھر مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بات کس کو بتاؤں یا......

سبھی لوگ سکپکا جاتے ھیں۔ ظھیر کے ھاتھوں سے صندوق کی چابی چھوٹ جاتی ھے شھزادی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ھیں۔ ممتاز سنجیدہ ھوجاتی ھے۔ چھوٹی نانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڑ پڑتاھے......

چھوٹی نانی: یا میرے خدا

اتنا کھہ کر وہ لگ بھگ بیجان ھو کر وھیں بیٹھ

جاتی ہیں اور گھٹنوں میں سِر دے کر پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔
ممتاز آگے بڑھ کر مشتاق کو سینے سے لگاتی ہے،
اُس ے سِر پر ھاتھ پھیر کر دوپٹّے سے منھ ڈھک کر
رونے لگتی ھے، اس کا ھاتھ پکڑے ہوئے چھوٹی
نانی کی طرف بڑھتی ھے۔ پھر چھوٹی نانی کے
کندھے پر ھاتھ رکھ کر، خود پر قابو پاتے ہوئے۔

ممتاز: بس کرو نانی

چھوٹی نانی گھٹنوں سے سِر اٹھاتی ہیں اور ممتاز
کواپنے سینے سے لگاتی ہیں۔ پھر وہ مشتاق کی
طرف ھاتھ بڑھاتی ہیں۔ مشتاق بھی رونے
لگتاھے تو وہ دوسرے ھاتھ سے مشتاق کو بھی
سینے سے چپٹالیتی ہیں اور ھچکیوں سے رونیلگتی
ہیں۔ پل دو پل بعد چھوٹی نانی ممتاز اور مشتاق
کو چھوڑ دیتی ہیں اور آھستہ آھستہ اٹھ کر

صندوق کے قریب پہنچتی ہیں شہزادی فوراً زمین پر گِری چابی اٹھاتی ہیں اور چھوٹی نانی کی طرف بڑھاتی ہیں۔ نانی کی نگاہیں ایک دو پل کے لئے چابی پر ٹکتی ہیں، پھر وہ تیکھی نظروں سے شہزادی کو گھورتی ہیں اور صندوق کے پاس بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے صندوق کو مضبوطی سے تھام لیتی ہیں۔

چھوٹی نانی: نہیں......نہیں......نہیں......بالکل نہیں......میں سکینہ کو یوں بے عزت نہیں ہونے دوں گی......اس صندوق کو کوئی نہیں چھوئے گا......اب یہ صندوق......سکینہ کے ساتھ اُس کی قبر میں جائے گی۔

چھوٹی نانی بڑی مضبوطی سے صندوق کو پکڑ لیتی ہیں۔......اور نڈھال ہو کر اس پر سر رکھ دیتی ہیں۔

(ختم شد)

چھوٹی ڈیوڑھی والیاں

ڈرامہ ''چھوٹی ڈیوڑھی والیاں'' پیچیدہ انسانی رشتوں کی کہانی ہے۔ یہ ڈرامہ جاگیردارانہ نظام میں عورت کی حالت اور اُن حالات میں زندہ رہنے کے لئے اُس کی جدوجہد اور اِس سے بڑھ کر چھوٹی ڈیوڑھی کے اُکھڑتے پلستر کو کسی بھی قیمت پر برابر تھامے رکھنے کی اُن کی کوشش کو اُبھارتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے مالوہ علاقے کے رنگ میں رنگا یہ ڈرامہ ڈھیتے ہوئے جاگیردارانہ ماحول میں دو خاص عورتوں کے کرداروں کے ذریعے اس سچائی کو اُبھارتا ہے کہ کیسے اُن حالات میں اپنی پچھلی زندگی سے چپک کر بیٹھے رہنا انسان کی عادت بن جاتی ہے اور کس طرح اوپری طور پر کڑوے اور نکیلے دکھائی دینے والے رشتوں کی تہوں کے نیچے جمی انسانیت ایک دن ابھر کر سامنے آتی ہے۔ رشتوں کی اچھی بری پینگیں بھرتی اِن کی زندگی میں سبھی کچھ جھلس جانے کے باوجود ایک ایسی ڈور بچھی رہتی ہے جو اِن رشتوں کی راکھ میں دبی چنگاریوں کو سلگائے رکھتی ہے۔

مسلم ماحول کی تصویر پیش کرتا یہ ڈرامہ سماج کے اُن حالات کو بھی کُریدتا ہے جہاں مذہب کے نام پر بنائے گئے بھنور میں پھنس کر ایک عام انسان کے لئے نارمل بنے رہ پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ڈرامہ میں آپسی رشتوں کے تانے بانے نہایت باریکی سے بُنے گئے ہیں۔ پرت در پرت کھلنے پر جو کردار اُبھر کر سانے آتے ہیں وہ زندہ ہو اُٹھتے ہیں، جیسے یہیں کہیں ہوں اپنے آس پاس۔

پرویز احمد

پیدائش اُجّین (مدھیہ پردیش) میں۔ وکرم یونیورسٹی، اُجّین سے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بارہ سال تک 'نوبھارت ٹائمس' دہلی کے ایڈیٹوریل بورڈ سے منسلک رہے۔ اسی دوران تقریباً تین سال تک اُس کے ہفتہ وار ضمیمہ کے ایڈیٹر رہے۔ ملک کے پہلی ٹی۔ وی چینل ٹی۔ وی۔ آئی کے سینئر پروڈیوسر کی حیثیت سے شعبۂ ہندی کی ذمہ داری سنبھالی۔ چار سال تک زی نیوز میں ایسوسی ایٹ ایڈیٹر رہنے کے بعد آجکل 'اے۔ آر۔ وائی۔ نیوز' کے ایڈیٹر انڈیا ہیں اور 'پریس کلب آف انڈیا' کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

مختلف رسائل میں مضمون اور کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔

رابطہ: 219، سماچار اپارٹمنٹ، میور وہار، فیز ا، دہلی 110091

سرورق: پرمود گن پتے